إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

دسمبر ۲۰۲۲ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

مقالاتِ تعلیم

پروفیسر محمد حسین ملک

مرتب

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان
لاہور

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)	
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب - خدشات و مضمرات	۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ وطالبات	۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
	طلبہ کی اسلامی تربیت	
۹	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲
۱۰	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت - ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس	
۱۱	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
۱۲	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۳	مدرسہ ڈسکورسز - مطالعہ وتجزیہ	۱۵۶
۱۴	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
	اسلامی تحریکیں	
۱۵	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۱۶	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸
۱۷	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴
۱۸	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
	تزکیۂ نفس	
۱۹	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
۲۰	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲

نمبر شمار	کتاب	صفحات
۲۱	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۲	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۳	اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)	
	اسلام اور مغربی فکر و تہذیب	
۲۴	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۲۵	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۲۶	اسلام اور ردِّ مغرب	۲۱۶
	تفہیم دین	
۲۷	مسلم نشاۃ ثانیہ - اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
۲۸	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۲۹	رزم حق و باطل	۸۰
۳۰	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
۳۱	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۳۲	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۳۳	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
	باللغة العربية	
۳۴	السلطة التشريعية _ دراسة مقارنة	۱۵۰
	English Books	
۳۵	Islamization of Laws in Pakistan	250
۳۶	Riyaz us Saliheen I & II	950
۳۷	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔

ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۶، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۲۲ء/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ

مشمولات

فکرونظر		
غلاموں کی منڈی	مدیر	۴
تعلیم و تربیت		
-مغربیت - دورِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ	مفتی تقی عثمانی	۵
-سفر افغانستان: برائے تعلیمی مقاصد	مدیر	۱۴
-پروفیسر محمد حسین ملکؒ کی یاد میں	ڈاکٹر عبدالحسیب مجاہد	۲۵
-تربیت: تعلیم سے زیادہ اہم ہے	مدیر	۳۴
-تہذیبی خودکشی	وجیہ احمد صدیقی	۴۱
-ہوم سکولنگ	بنت کرم	۴۶
میڈیا		
فلم جوائے لینڈ پر پابندی لگنی چاہیے	عامر خاکوانی	۴۸
تزکیۂ نفس		
-'خیر القرون': ایک مثالی اسلامی معاشرہ جسے اپنانے کو ہم تیار نہیں	سید خالد جامعی	۵۲
-اپنے حصے کی شمع جلاتے رہو	پروفیسر ایم اے رفرف	۵۹
تفہیم مغرب		
-مغرب کے تضادات	سید خالد جامعی	۶۰
-مغرب کی تحریک مساوات مردوزن	رضی الدین سید	۶۱
فکرودانش		
-کیا ہمارے دینی حلقے غیر مؤثر اور ناکام ہیں؟ مجلس فکرودانش کا علمی مذاکرہ	حافظ محمد عمران طحاوی	۶۷
-اہل علم وعمل میں توافق کی ضرورت	مکرم محمود	۷۵
تبصرۂ کتب		
-مختلف کتب پر تبصرے	مدیر/ ڈاکٹر عبدالحسیب	۷۷

English Section ۸۲

The Imperialist Attack on Islamic Orthodoxy
Dr. Javed Akbar Ansari

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِاعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے - پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 40,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

غلاموں کی منڈی

آج ۲۸ نومبر ۲۰۲۲ء ہے۔

حکمران مسلم لیگ ن کے سابق وزیر خزانہ مفتاح اسماعیل اور دوسرے بہت سے اہم معاشی ماہرین نے ملک کے دیوالیہ ہونے کا شدید خطرہ ظاہر کیا ہے۔

ہم پچھلے ایک سال سے کہہ رہے تھے کہ پلانڈ ڈیفالٹ (Planned Default) کرو اور ملک اور عوام کو بچالو لیکن ہماری کسی نے نہیں سنی۔ سبب اس کا یہ ہے کہ گوری چمڑی والے کے سامنے بولے کون؟

ہم بھیڑیں ہیں اور ہمارے چرواہے غلام، بلکہ غلاموں کی منڈی لگی ہے۔ حکمران، فوج، اپوزیشن، بیوروکریسی، عدلیہ.... سب کے سب فکری بلکہ عملی غلام۔ جائیں تو جائیں کہاں؟

کوئی محب وطن نہیں چاہتا اور ہم بھی نہیں چاہتے کہ پاکستان میں خدانخواستہ سری لنکا جیسے حالات پیدا ہوں جہاں ضروریات زندگی ناپید ہوگئیں، گھیراؤ جلاؤ شروع ہوگیا، ہجوم نے صدارتی محل پر دھاوا بول دیا اور صدر کو ملک سے فرار ہونا پڑا۔

لیکن اگر حکومت اور اسٹیبلشمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ وہ زبان بندی سے ملک پر ہول طاری کردیں گے اور کوئی بول نہیں پائے گا تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ عوام کے ہاتھ ہوتے ہیں اور حکمرانوں کے گریبان۔ اس وقت اسٹیبلشمنٹ بھی معطل ہوجاتی ہے اور زبان خنجر اگر چپ رہے تو آستین کا لہو ہی پکار اٹھتا ہے۔

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیراں دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تعلیم و تربیت　　مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

مغربیت - دورِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ

دینی مدارس کے فضلاء کو علمی بنیادوں پر اس فتنے سے نمٹنے کا اہل ہونا چاہیے

جامعہ دار العلوم کراچی کے تخصص فی الدعوۃ والارشاد کے طلبہ سے خطاب

تخصص فی الدعوۃ والارشاد کے اجراء کا بنیادی مقصد

الحمدللہ! آپ حضرات کے تاثرات سنے اور اس سے اطمینان بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ جب ہم اس تخصص کا اجراء کر رہے تھے تو اس وقت ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتنا مفید ہوگا! اگر چہ جب ہم نے اس کے لیے موضوعات تجویز کیے اور اس کا نصاب بنایا تو اپنی دانست میں یہ سوچ کر بنایا کہ دورۂ حدیث سے جو طلبہ فارغ ہوتے ہیں اور درسِ نظامی کی تکمیل کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دین کی بنیادی تعلیمات تو پوری طرح اس میں آجاتی ہیں اور ہمارا آخری ملجا وماویٰ یہی ہیں جو فقہ، عقائد، تفسیر اور حدیث ہم پڑھتے ہیں، یہی سارے علوم کی بنیادیں ہیں۔ لیکن ہر زمانے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور ان تقاضوں کے مطابق ایک داعی کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات سے پوری طرح باخبر ہو کر دین کی دعوت کا فریضہ انجام دے تو اس لحاظ سے ہم نے یہ نصاب مرتب کیا تھا کہ درسِ نظامی کی تکمیل کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اس بات کا اہل بنایا جائے کہ وہ دورِ جدید میں پھیلے ہوئے مسائل کو نہ صرف سمجھیں بلکہ جن لوگوں کو ان مسائل نے ذہنی طور پر اسلام سے یا اہلِ علم سے دور کیا ہوا ہے، ان کو قریب لانے کی ان میں صلاحیت پیدا ہو، یہی اس تخصص کا بنیادی مقصد ہے۔

فتنۂ مغربیت اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ

اس وقت ہر طرف فتنوں کی بھرمار ہے۔ یعنی صورت حال وہ ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی کہ "تقع الفتن فی بیوتکم کوقع المطر" یعنی بارش کے قطروں کی طرح تمہارے اوپر فتنوں کی بارش ہوگی۔ یہ وہی زمانہ ہے لیکن اس میں ایک فتنہ ایسا ہے جو بہت سے فتنوں کی جڑ ہے اور وہ ہے مغربیت کا فتنہ یعنی ذہنوں پر یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ مغرب ہی بہتر ہے،

فکری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی۔ اس کی برتری ذہنوں پر اس طرح بٹھا دی گئی ہے کہ جو چیز مغرب سے آئے گی، اس کو تو مستند سمجھا جائے گا اور جو چیز مغرب سے نہیں آئے گی اس کو مستند نہیں سمجھا جائے گا۔

یہ تصور کس طرح پھیلایا گیا؟ آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب لارڈ میکالے نے استعمار کے دور میں یہ نظام تعلیم جاری کیا تو اس کا بنیادی مقصد یہ تھا اور یہ مقصد اس نے صاف صاف بتا دیا تھا، کچھ پوشیدہ نہیں رکھا کہ اس نظام تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں کہ چمڑی جن کی ہندوستانی ہو اور ذہن ان کا انگریزی ہو۔ یہ جو موجودہ نظام تعلیم ہم پر مسلط ہے وہ معمولی تبدیلیوں سے قطع نظر ابھی تک اسی نہج پر چلا آ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے اب تک مغرب کی غلامی ہمارے معاشرے کے اوپر بلکہ پوری امت کے اوپر چھائی ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ہمارے اپنے علوم ہیں یا ہمارے اپنے عقائد ہیں ان علوم اور عقائد کو ایک رجعت پسندانہ اور پرانے زمانے کی باتیں سمجھ کر آج کل کے نوتعلیم یافتہ لوگ کسی طرح چارو ناچار قبول تو کر لیتے ہیں کیونکہ مسلمان رہنا ہے، مسلمان معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں لہٰذا ایک طرح سے مجبور ہیں کہ اپنے آپ کو مسلمان رکھیں، نماز کا انکار نہ کریں، پڑھیں یا نہ پڑھیں، روزے کا انکار نہ کریں، رکھیں یا نہ رکھیں، تو کم از کم اس معاشرے سے کسی نہ کسی طرح اپنا تعلق جوڑے رکھنے کی حد تک اپنے آپ کو مسلمان تو ضرور سمجھتے ہیں لیکن اکثریت اس نظام کے پڑھے ہوئے لوگوں کی ایسی ہے کہ جو دل کی دنیا سے اسلام کے احکام اور اسلام کی تعلیمات کو قبول نہیں کرتے۔

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا عجیب جملہ

مَیں نے اپنے والد ماجدؒ سے حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کا ایک جملہ سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے جو نوتعلیم یافتہ لوگ ہیں ان کو ہم اس بنا پر مسلمان کہتے ہیں کہ ہمیں ان کا کفر معلوم نہیں۔ یہ بڑا عجیب جملہ ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ نوتعلیم یافتہ طبقہ چارو ناچار اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اگر عقیدہ کی بات پوچھو تو کہہ دیں گے کہ ہاں آخرت کے اوپر ایمان ہے لیکن ایمان ایسا ہے کہ ایک مرتبہ مَیں جہاز میں جا رہا تھا تو ایک صاحب میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ مولانا! میں مسلمان ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ کیا واقعی آخرت کوئی چیز ہے؟ کیا ایسا ہوگا؟ کیا مرنے کے بعد دوبارہ

زندہ ہوں گے؟ اور کوئی ہمارا حساب کتاب ہوگا؟ اس بیچارے نے اپنی زبان سے پوچھ لیا ورنہ بیشتر کی حالت یہ ہے کہ وہ پوچھتے بھی نہیں اور پوچھنے سے بھی شرماتے ہیں۔اب پتا نہیں دل میں کیا کیا شکوک وشبہات لیے بیٹھے ہیں؟ بلکہ ایک طرح سے احساس کمتری لیے بیٹھے ہیں کہ بھئی ہم تو ڈاگمیٹک (Dogmatic) لوگ ہیں یعنی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو عقیدہ ہم نے بنالیا ہے بغیر سوچے سمجھے اسی کو لے کر بیٹھ گئے، چاہے وہ عقل کے مطابق ہو یا نہ ہو، چاہے وہ موجودہ دور میں قابل عمل ہو یا نہ ہو، ہم تو ویسے بیٹھے ہوئے ہیں، اصل ترقی تو مغرب میں ہو رہی ہے، تو اس فتنہ کی وجہ سے جب اسلام کے اندر کچھ پیوند لگانے یا اسلام کو کچھ توڑنے مروڑنے کی نئی فکر مغرب سے آتی ہے تو یہ مرعوب طبقہ سب سے پہلے اس پر لبیک کہتا ہے، اس واسطے کہتا ہے کہ اس کے دل میں ایک ہیجان برپا ہے کہ وہ ایک طرف نام کا مسلمان بھی رہنا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح امت سے جوڑے بھی رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے عقائد اور تعلیمات کو اس کا ذہن قبول نہیں کرتا۔اسی وجہ سے جب بھی کوئی پرویز صاحب اٹھ جائے اور کہے کہ ہم حدیث کو نہیں مانتے تو اس طبقہ نے کہا کہ بڑی بہترین بات ہے، اس لیے بہت سے مسلمان ظاہراً تو مسلمان رہے لیکن حدیث کی روایتوں کے منکر ہو گئے۔کوئی دوسرا آتا ہے تو کہتا ہے حدیث تو ٹھیک ہے لیکن ہم اپنی عقل سے بھی غور کریں گے اور عقل سے غور کر کے حدیث کا فیصلہ کریں گے کہ حدیث صحیح ہے کہ نہیں ہے۔ یہ سند تو ایسے ہی فضول کی چیز ہے بلکہ اس پر تاریخی تنقید (Historic Criticism) بھی کرنی چاہیے۔غرض طرح طرح کے بہانے ہیں اور یہ سارے بہانے اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ اندر سے دل مطمئن نہیں اور مطمئن اس لیے نہیں کیونکہ دماغ پر مغرب کی بالادستی کا ایک ہَوّا سوار ہے۔

مغرب کی ٹیکنالوجی میں برتری کا اثر

اس ہَوّے کی ایک بڑی وجہ مغرب کی ٹیکنالوجی میں برتری ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب نے اس دوران جو مادی ترقی کی ہے اور ٹیکنالوجی میں جو اس نے برتری حاصل کی ہے وہ ایسی ہے کہ ہر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ہم آج یہاں بیٹھے ہیں تو ہم نے اپنے ہاتھ میں جو گھڑی پہنی ہوئی ہے، یہ ٹیلی فون جو ہمارے سامنے رکھا ہے اور یہ ریکارڈر جو ہمارے سامنے رکھا ہے، یہ سب چیزیں کہاں سے آئیں؟ مغرب سے آئیں۔

اس وقت ہماری جتنی بھی زندگی کی ضروریات ہیں، وہ ساری مغرب پر موقوف ہیں۔جتنی ایجادات ہیں وہاں سے ہوئی ہیں۔یہ ہم ضرور کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ اس کا آغاز تو مسلمانوں نے کیا تھا اور مسلمانوں نے وہ اصول وقواعد دیے تھے جن کی پیروی کر کے یہ ایجادات کی گئیں لیکن ان قواعد اور اصولوں سے فائدہ اٹھانے والے تو یہی ہیں۔ہم نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا، انہوں نے فائدہ اٹھالیا۔ہمیں کہیں سفر کرنا تو ان کی ایجادات کی ضرورت ہے، چاہے وہ موٹر سائیکل کیوں نہ ہو، چاہے وہ کار کیوں نہ ہو، چاہے وہ ریل کیوں نہ ہو، چاہے وہ ہوائی جہاز کیوں نہ ہو،سب انہی کی ایجادات ہیں اور آج ٹیکنالوجی کو کہاں سے کہاں پہنچانے والے یہی ہیں اور ہم ٹیکنالوجی کے میدان میں صفر ہیں۔ہمارے ملک کے صوبے بلوچستان، ریکوڈک، میں سونا موجود ہے لیکن ہم خود اس سونے کو نکالنے پر قادر نہیں ہیں۔مغرب ہی کی کسی کمپنی سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ تم آ کے نکالو اور آدھا تمہارا ہوگا اور آدھا ہمارا ہوگا۔بے شک مغرب نے اس میدان کے اندر جو ترقی کی ہے وہ بحیثیت مجموعی قابل تعریف ہے لیکن بات یہاں سے بگڑتی ہے کہ اگر کوئی شخص ٹیکنالوجی میں ماہر ہے تو کیا میٹافزکس (مابعد الطبیعیات) میں بھی وہ اتنا ہی ماہر ہوگا؟ یہاں سے لائن بدلتی ہے کہ یہ سب چیزیں جو ہیں ان کا تعلق کہاں سے ہے؟ یہ جو چیزیں پیدا ہو رہی ہیں یا نئی سے نئی ایجادات ہو رہی ہیں ان کا تعلق کہاں سے ہے؟ مادّہ سے ہے، لیکن مادّے کے ماوراء بھی کوئی چیز ہے؟ مادّہ کے اس پار بھی کوئی جہان ہے جس کو ہمارے قدیم فلسفہ کی اصطلاح میں ماوراء الطبیعیات کہتے ہیں اور آج اس کو میٹافزکس کہا جاتا ہے۔

یہ جو ایک تصور پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص کسی ایک چیز میں بہت اونچے مقام پر پہنچ گیا تو پھر وہ ہر فن مولا ہو گیا، پھر ہر چیز میں وہ قابل تقلید ہو گیا۔اس تصور نے یہ گڑبڑ پیدا کی ہے کہ چونکہ انہوں نے ٹیکنالوجی (مادّیات) میں بہت بڑا مقام حاصل کر لیا ہے لہٰذا میٹافزکس (روحانیات) میں بھی اسی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

ایک فن کے ماہر کو ہر فن مولا سمجھنا

یعنی غلطی یہاں سے لگی کہ ایک فن کے ماہر کو ہر فن کا ماہر سمجھا گیا۔اس بات کو مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔جنوبی افریقہ کے جناب احمد دیدات صاحب نے عیسائیت کے مقابلے میں بہت زبردست کام کیا اور اس میں انہوں نے بہت مہارت حاصل کی اور بہت اونچے درجے

تک پہنچے اور پتا نہیں کتنے لوگوں کو مسلمان کیا اور انہی کے طریقے پر ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب ہیں۔ جب عیسائیت کے میدان میں ان کی شہرت ہوئی تو اب دنیا بھی یہ سمجھنے لگی اور خود انہوں نے بھی اس میں کوئی تأمل نہیں کیا کہ وہ ہر چیز میں ماہر ہیں کہ جب وہ عیسائیت کے ردّ میں ماہر ہیں تو فلسفہ میں بھی ہوں گے، پھر حدیث میں بھی ہوں گے، پھر ہر چیز میں ہوں گے۔

یہ ایک مثال نہیں۔ اسی طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ یہی معاملہ مغرب کے ساتھ ہوا۔ اس کا اعتراف کرنے میں ہمیں کوئی تأمل نہیں ہے کہ ٹیکنالوجی اور سائنس میں انہوں نے بہت اعلیٰ درجے کی ترقی کی ہے اور اس میں ہماری مہارت ان کی مہارت کے مقابلے میں صفر ہے، لیکن بات یہ ہے کہ اگر ایک کاریگر ہے جو کار بناتا ہے کیا وہ فلسفہ کا بھی ماہر ہوگا؟ کیا وہ مابعد الطبیعیات کا بھی ماہر ہوگا؟ کیا اس کے تمام افکار قابل تقلید ہوں گے؟ کیونکہ یہ بہترین کاریگر ہے لہٰذا اس کی ہر بات مانو، جو بات بھی یہ کہے گا وہ صحیح ہے، جس بات کو بھی یہ غلط کہے گا وہ غلط ہے، تو ہم نے یہی معاملہ مغرب کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم سے میری مراد یہ نظامِ تعلیم ہے کہ جس چیز میں اس نے مہارت واقعتاً حاصل کی ہے اس نظامِ تعلیم نے دماغ میں یہ بٹھا دیا کہ اب جو بھی نظریہ اور جو چیز بھی وہاں سے آئے گی وہی مستند ہوگی، وہی مقبول ہوگی، وہی جدید ترین ہوگی اور عصرِ جدید کا بہترین تقاضا وہی ہوگا، اس تصور سے سارا معاملہ الٹ گیا۔

اسلام کی روح اور مغرب کے مادہ کے مابین سمجھوتہ

اب مسلمان کا کام تو یہ تھا کہ وہ کہتا کہ بھائی! تم بڑے اچھے کاریگر ہو، تم نے بڑی اچھی صنعتیں لگائی ہیں، تم نے ایجادات بڑی اچھی کی ہیں، لیکن تم روح کے ماہر نہیں ہو، تم مادّے کے ماہر ہو۔ روح ہمارے پاس ہے اور وہ ہمارے قرآن میں ہے، وہ ہماری حدیث میں ہے، وہ ہمارے علوم میں ہے۔ روح تم ہم سے حاصل کرو، مادّہ ہم تم سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر یہ سمجھوتہ ہو جاتا تو یہ دنیا امن کا گہوارہ بن جاتی لیکن مسلمانوں نے یہ کیا کہ بھائی تم بہت زبردست کاریگر ہو گویا تم ہی قابل تقلید ہو، تمہارا لباس بھی قابل تقلید ہے، چاہے وہ ساتر نہ ہو، تمہارا طرزِ زندگی بھی قابل تقلید ہے، چاہے وہ ہمارے سنت کے طریقے سے مختلف ہو۔ تمہارے افکار بھی قابل تقلید ہیں کیونکہ تمہاری سائنس کی بنیاد تمہارے فلسفہ پر ہے اور فلسفہ میں بھی تم برتر و بالا ہو، لہٰذا یہ مولوی ملّا جو بات کرتا ہے اس کو نہ دنیا کی خبر ہے، نہ اس کو ٹیکنالوجی کا پتا ہے، نہ اس کو ان جدید افکار کا پتا

ہے جو مغرب نے پیدا کیے ہیں، اس واسطے یہ اپنے بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ کر جو سبق پڑھاتا ہے، اسے پڑھانے دو لیکن زندگی کے عام بہاؤ میں اس کا کوئی کردار نہیں۔ یہ صورتِ حال ہماری اس امت میں پیدا ہوگئی۔

احساس کمتری کا شکار مسلمان

اس لیے اس دور کے فتنوں میں سب سے بڑا فتنہ مغربیت کا فتنہ ہے اور اسی سے بہت سارے شاخسانے پیدا ہوئے۔ یہ وہ شاخسانے ہیں جو الحاد کی طرف لے جا رہے ہیں، جو دہریت (Atheism) کی طرف لے جا رہے ہیں۔ جو نوجوان پہلے اپنے آپ کو شرما شرما کر مسلمان کہتا تھا اب کھلم کھلا اپنے آپ کو دہریہ (Atheist) کہنے میں باک محسوس نہیں کرتا۔ ہم اگر لاکھوں افراد وفاق المدارس سے پیدا کر رہے ہیں تو ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس مغربیت کے سیلاب پر بند باندھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ کم از کم وہ ذہنی غلام نہ ہوں۔ اب ہم آپ بیٹھے ہوئے ہیں، ہم اپنے آپ کو طالب علم کہتے ہیں، علماء کی صف میں شامل سمجھتے ہیں۔ اگر سچ کہا جائے 'العیاذ باللہ' تو بہت سے علماء کے اندر بھی مغرب کے مقابلے میں شدید احساس کمتری ہے اور یہ احساس کمتری اندر چھپا ہوا ہے، اس لیے کہ اگر مغربیت زدہ افراد کے ساتھ بات کرنے کا موقع آجائے، تو ان کی گفتگو احساس کمتری کے ساتھ ہوگی، آگے بڑھ کر نہیں ہوگی، آپ دیکھیں کہ ہم انگریزی نہیں جانتے یعنی ہمارا طبقہ انگریزی زبان نہیں جانتا لیکن اگر کہیں انگریزی لفظ بولنے کا موقع مل جائے تو انگریزی کا لفظ بھی بولے گا، وہ الفاظ جو انگریزی کے عام ہو گئے ہیں وہ بولے گا تاکہ دوسرے پر یہ ظاہر ہو کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔

پتا نہیں کتنے لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ نے آسان ترجمہ قرآن لکھا ہے۔ بریکٹ میں کچھ انگریزی الفاظ لکھ دیتے تو اس سے لوگوں کو پتہ چلتا کہ یہ آدمی انگریزی دان ہے اور اس نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے۔ تو یہ ایک احساس کمتری ہے۔

ضیاء الحق صاحب مرحوم کے دور میں مجھے جج بنا دیا گیا، میرے نام کے ساتھ جسٹس لکھا جاتا تھا، میں نے وہاں سے نکلنے کے بعد اپنے نام کے ساتھ جسٹس کا لفظ نہیں لکھا، مجھ سے لوگوں نے کہا کہ اپنی کتاب پر تمہیں لکھنے کا حق ہے، جسٹس (ر) محمد تقی عثمانی کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے کہہ دیا

کہ مجھے پسند نہیں، مجھے تو مفتی کہلانا بھی پسند نہیں، مَیں صرف محمد تقی عثمانی لکھنا چاہتا ہوں، لیکن کچھ حضرات ایسے ہیں جنہیں جسٹس یا ڈاکٹر کہلانے میں زیادہ فخر محسوس ہوتا ہے، بتاؤ یہ کیا ہے؟ کیا یہ احساس کمتری نہیں ہے کہ ہمیں مولوی لکھنے میں تأمل ہوتا ہے، مفتی لکھنے میں تأمل ہوتا ہے، اور جسٹس لکھنے میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں۔

مغربیت کا سیلاب اور ہماری غفلت

اس مغربیت کے سیلاب نے یہاں تک نوبت پہنچادی ہے کہ احساس کمتری ہمارے اندر گھس آیا ہے، اس لیے افسوس ہوتا ہے۔ جو ہمارے مختلف فرقے ہیں، اہل حدیث ہیں، بریلوی حضرات ہیں اور خود دیوبندیوں کے اندر حیاتی مماتی اور ان کے آپس کے یہ سارے جھگڑے یہ سب اس سیلاب سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں جو ہماری پوری امت کے اوپر حملہ آور ہے، جو نہ دیوبندی کو دیکھے گا، نہ بریلوی کو دیکھے گا، نہ اہل حدیث کو دیکھے گا، نہ حیاتی کو دیکھے گا نہ مماتی کو دیکھے گا۔ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ لہٰذا دل میں خواہش پیدا ہوئی اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم بڑے پیمانے پر نہ سہی لیکن چھوٹے پیمانے پر کم از کم اپنے طلبہ کو اس مغربیت سے آشنا تو کردیں، تا کہ ان کو پتہ چل جائے کہ مغربیت کے سوتے کہاں سے پھوٹے اور کن چیزوں سے مغربیت کا یہ تصور دنیا پر چھا گیا ہے اور کون سی وہ گمراہیاں ہیں اور گمراہیوں کے کون سے دروازے ہیں جن کے ذریعے مغربیت کا یہ سیلاب ہمارے معاشرے کے اندر اتر آیا ہے۔

شعبہ تخصص فی الدعوۃ والارشاد کے دو اہم مقاصد

اس لیے ہمارے یہاں اس تخصص فی الدعوۃ والارشاد میں اگرچہ مسلمان فرقوں کا درس بھی شامل ہے، اس کا ایک تاریخی اعتبار سے مطالعہ بھی مفید ہے اور فی نفسہ بھی بہر حال مفید ہے لیکن ہمارا اصل زور جو ہے وہ ایک تو مثبت دعوت کے اوپر ہے اور دوسرا اگر نفی کام ہے تو وہ مغربیت کے خلاف ہے، مثبت کام ہے دعوت الی اللہ، یہ اگر صحیح طریقے سے انجام دیا جائے تو باطل خود مٹے گا، ان شاء اللہ۔

مثبت دعوت کی تاثیر

میرے والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اندھیرے کا علاج یہ نہیں ہے

کہ اس کے پیچھے لاٹھی لے کر اندھیرے کو بھگاؤ بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ چراغ روشن کر دو کہ ایک چراغ روشن کر دو گے تو اندھیرا خود بھاگے گا، چراغ جتنا قوی ہوگا اتنا اندھیرا ختم ہوگا، تو حق ایک نور ہے اور باطل ایک اندھیرا ہے، تو باطل کو ختم کرنے کے لیے دھینگا مشتی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حق کے نور کا چراغ جلانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے مثبت دعوت جہاں پر بھی ہوتی ہے، آپ دیکھیں گے کہ تردید کے مقابلے میں کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ تبلیغی جماعت کو آپ دیکھ لیجیے حالانکہ تبلیغی جماعت میں نفی کا کوئی تصور نہیں ہے، صرف چھ نمبر ہیں اور چھ کے چھ مثبت ہیں وہ نہ آپ سے یہ کہتے ہیں کہ ڈاڑھی رکھو، نہ آپ سے یہ کہتے ہیں کہ پینٹ شرٹ اتار دو، نہ یہ کہتے ہیں کہ شرعی لباس پہنو، لیکن چھ نمبر جب بندوں کے دل میں اتر جاتے ہیں تو پھر وہ خود دوسری چیزیں اتار کر پھینک دیتے ہیں، یہ مثبت دعوت کا اثر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دو باتیں مقصود ہیں، ایک مثبت دعوت اور دوسرے جو سب سے بڑا فتنہ ہے یعنی مغربیت، اس کی نفی اور تردید۔ اسی کے لیے ہمیں ضرورت پیش آتی ہے کہ عیسائیوں کی بھی بات کریں کہ کیا کہہ رہے ہیں اور یہودی مذہب دیکھیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اسی طرح ہندوؤں کے مذہب کو بھی دیکھیں، آج ہندوؤں کی طرف سے جو ہندوستان میں ایک مصیبت برپا ہے، تو کم از کم معلوم تو ہو کہ وہ مذہب ہے کیا؟ اسی طریقے سے مغربیت کے بارے میں جو اس کے بنیادی افکار ہیں ان کا پتہ لگے کہ کس طرح ہمارے لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا ہے۔

دورِ جدید اور اس کے تقاضے

جب مغربیت کے بنیادی افکار و نظریات اور باطل مذاہب کے بارے میں واقفیت ہوگی تو اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کے ذہن میں ایک وسعت پیدا ہوگی اور ان شاء اللہ ایسے ہتھیاروں سے مسلح ہوں گے جو اس وقت کی ضرورت ہیں۔ آج کوئی تلوار کی جنگ نہیں ہوتی بلکہ آج بموں، بندوقوں اور رائفلوں کی جنگ ہوتی ہے تو اسی طریقے سے جو فکری جنگ ہے اس فکری جنگ کے لیے بھی نئے ہتھیاروں کی ضرورت ہے اور نئے ہتھیار اسی طریقے سے حاصل ہوں گے جس کے لیے ہم نے یہ تھوڑا سا دو سالہ نصاب بنایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اس کی بعض چیزیں درسِ نظامی کے اندر پروئیں تاکہ یہ بات صرف تخصص فی الدعوۃ والارشاد کی حد تک محدود نہ رہے بلکہ اس کی بنیادی چیزیں درس نظامی کے نصاب کے اندر پروئی ہوئی ہوں جیسا کہ یونانیوں

کی منطق یا یونان کا فلسفہ، یہ کہاں سے آ گیا؟ اس کا کوئی تعلق قرآن اور حدیث سے ہے؟ تفسیر یا فقہ سے ہے؟ کسی چیز سے نہیں لیکن یہ وہ ہتھیار تھے جو طلبہ کو اس وقت کے فلاسفہ کا مقابلہ کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔

چونکہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان درحقیقت ۲۳ ہزار مدارس پر مشتمل ہے اور اس میں جہاں یہ کراچی کا دارالعلوم ہے، جامعہ علوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن ہے، جامعہ فاروقیہ ہے، جامعہ خیر المدارس اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے بڑے بڑے جامعات ہیں اسی طرح ایسے بھی مدارس ہیں کہ بلوچستان کے ایک گاؤں میں مدرسہ قائم ہے، خیبر پختونخوا کے ایک گاؤں میں قائم ہے، پنجاب کے ایک گاؤں میں، سندھ کے ایک گاؤں میں مدرسہ قائم ہے اور وہ بیچارے گاؤں میں اپنے وسائل کے لحاظ سے کام کر رہے ہیں تو ہم کوئی ایسی چیز ان پر مسلط نہیں کر سکتے جو ان کی طاقت سے باہر ہو، یہ ہماری حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر رہ کر ہمیں کام کرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا تدریج کے ساتھ کرنے کا ارادہ ہے لیکن یہ ارادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو جس طرح یہ یونانی منطق اور فلسفہ یونانی ہمارے نصاب کا حصہ تھا اسی طریقے سے ضرورت کے دیگر مضامین بھی ہم اس میں داخل کریں گے ان شاءاللہ تا کہ ہمارے طالب علم کو اس کام کے لیے مزید دو سال خرچ کرنے کی ضرورت نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ چلتا جائے۔ لیکن اس تخصص میں صرف یہی نہیں ہے بلکہ دیگر چیزیں بھی ہیں مثلاً انگریزی اور عربی زبان کی تعلیم، مثبت دعوت کے اصول ومناہج۔ اسی طرح فقہ السیرۃ کا عظیم الشان مضمون ہے جس کا مطالعہ کرنے اور پڑھنے سے خود اپنی شخصی تعمیر میں ان شاءاللہ مدد ملے گی۔ اس لیے تخصص فی الدعوۃ والارشاد کی ضرورت پھر بھی رہے گی۔

دعائیہ کلمات

آخر میں دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت عطا فرمائے اور علم نافع اور عمل صالح سے نوازے اور جو اساتذہ ماشاءاللہ آپ کو پڑھا رہے ہیں، انہیں مزید توفیق سے نوازے، سب کو علم اور عمل کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اور فیض پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے، ان لمحات کو غنیمت سمجھیں اور زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین۔

تعلیم و تربیت پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

سفرِ افغانستان - برائے تعلیمی مقاصد

افغانستان کے بارے میں تازہ ترین مشاہدات

* راقم ابتداء ہی سے افغان جہاد کا حامی رہا ہے۔ افغان قوم ایک جری و بہادر قوم ہے جس نے اپنی آزادی پہ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور ہمیشہ بیرونی قوتوں کی مزاحمت کرتی رہی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں جب مَیں سعودی عرب سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آیا (میں نے وہاں سے ماجستیر/ ایم فِل فقہ واصول فقہ میں جامعہ ملک سعود سے کیا تھا) تو وہ روس کے خلاف افغان جہاد کا آخری مرحلہ تھا۔ پاکستان میں مجھے کچھ ایسے دوستوں سے مل کر کام کرنے کا موقعہ ملا جو جہاد افغانستان کی حمایت میں متنوع سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ اسی حوالے سے مرحوم ایم ایم عالم سے بھی رابطہ رہا۔ بلکہ ایک دفعہ تو ہم جہاد میں شامل ہونے کی نیت سے میران شاہ بھی گئے لیکن بوجوہ بارڈر نہ کراس کر سکے اور دور سے پہاڑیوں کے اوپر جا کر میدانِ کارزار کا مشاہدہ کر کے واپس آ گئے۔

جب ہم نے ۲۰۱۰ء میں ماہنامہ'البرہان' جاری کیا تو اس میں افغان جہاد کی حمایت ہماری مستقل پالیسی رہی اور جب طالبان کو اللہ تعالیٰ نے عالم کفر کے متحدہ لشکر کے مقابلے میں بیس سالہ جدوجہد کے بعد فتح عطا فرمائی تو ہم نے 'البرہان' میں اس پر خوب لکھا اور نئی حکومت کی ترجیحات اور پالیسیاں کیا ہونی چاہئیں، کے موضوع پر متعدد مضامین شائع کیے خصوصاً کراچی کے بزرگ دانشور اور ماہر معاشیات ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے کئی مضامین طالبان کی امارت اسلامیہ کی معاشی ترجیحات اور راقم نے اس کی تعلیمی ترجیحات کے بارے میں لکھے۔

* چند ماہ پیشتر ایک افغان حمایتی دوست سے ملاقات ہوئی تو یہ بات زیر بحث آئی کہ پاکستان سمیت مسلمان حکومتیں تو امریکہ و یورپ کے دباؤ کی وجہ سے طالبان کی امارت اسلامیہ کو تسلیم نہیں کر رہیں لیکن مسلم عوام، خصوصاً پاکستان، کے دینی عناصر کو چاہیے کہ وہ افغانستان کی تعمیر نو میں امارت اسلامی کا ہاتھ بٹائیں تا کہ افغانستان ایک مثالی اسلامی معاشرہ اور ایک مثالی اسلامی ریاست بن کر سامنے آئے کیونکہ سارے عالم اسلام میں اگر کوئی حکومت حقیقی اسلام کی علمبردار

بننے اور عالم کفر کے مقابلے میں کھڑی ہونے کی ہمت رکھتی ہے تو وہ افغانستان کی امارت اسلامیہ ہی ہے۔اس سلسلے میں یہ طے ہوا کہ ہم البرہان اور دوسرے ذرائع سے یہ پیغام امت اسلامیہ اور پاکستانی عوام اور دینی عناصر تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

ہمارا تخصص چونکہ شعبۂ تعلیم ہے لہٰذا ہم نے سوچا کہ افغانستان کے تعلیمی حالات کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیے اور اس کے لیے افغانستان جانا چاہیے۔اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ امریکہ ویورپ نے وہاں پچھلے بیس سالوں میں اپنا حامی نظریاتی طبقہ پیدا کرنے کے لیے بہت زیادہ کوششیں کی ہیں لہٰذا وہاں کے نظام تعلیم کی اصلاح اور ماڈل تعلیمی اداروں کے قیام کا جائزہ لینا چاہیے۔اس کے لیے ہم نے پاسپورٹ بنوایا، اسلام آباد سے ویزہ لگوایا اور مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب (مدیر جامعہ ابی ہریرہ والقاسم اکیڈمی اور ماہنامہ القاسم) اور جامعہ حقانیہ کے مہتمم مولانا راشد الحق صاحب (صاحبزدہ مولانا سمیع الحق شہیدؒ) سے رابطہ کیا جنہوں نے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور امارت اسلامیہ کے پشاور میں افغان قونصلیٹ سے ہماری اعانت کی درخواست کی۔

افغان قونصلیٹ نے ہمیں بدھ ۱۶ نومبر کو اطلاع دی کہ ہم اگلے دن ان کے پاس پشاور پہنچ جائیں۔مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کے ساتھ یہ طے ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ جائیں گے لیکن وہ بعض اعذار کی بناء پر ہمارے ساتھ نہ جاسکے۔ہم نے چاہا کہ جانے سے پہلے یہ پتا چل جائے کہ کیا کابل میں وزارت اعلیٰ تعلیم اور وزارت معارف (برائے سکولز) کے ذمہ داران سے ہماری ملاقاتیں طے ہوگئی ہیں اور ہماری رہائش اور سواری کا انتظام ہوگیا ہے، لیکن وہاں سے ایک ہی جواب ملا کہ بس آپ قونصلیٹ پہنچ جائیں۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ انہوں نے ہمارے اس تعلیمی دورے کو سرکاری حیثیت دے دی ہے اور ہم امارت اسلامیہ کے مہمان ہیں۔ حافظ محمد عمران طحاوی صاحب (اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ میں میرے معاون اور پی ایچ ڈی سکالر) اور اسلام آباد کے ہم خیال دوست زاہد اقبال صاحب (ڈائریکٹر قرطبہ اسلامک سنٹر) بھی میرے ہمراہ تھے۔

٭ اس کے بعد ہمارے ساتھ جو حسن سلوک ہوا اور ہمیں جو عزت دی گئی وہ کبھی ہمارے خواب وخیال میں بھی نہ تھی۔ پاکستان میں ایک پروفیسر یا ایک دانشور کی کیا وقعت وحیثیت ہے وہ آپ سب جانتے ہیں لیکن وہاں یہ ہوا کہ ہمیں قونصلیٹ کی گاڑی ایک پولیس مین کے ساتھ طورخم چھوڑنے گئی اور اس نے ہمیں چند منٹوں میں ایگزٹ (Exit) کی مہر لگوادی۔ دوسری طرف ننگر ہار صوبہ (جو پاکستان سے ملحق صوبہ ہے اور جس کا صدر مقام جلال آباد ہے) کے گورنر صاحب

کی بھیجی ہوئی گاڑی مع پولیس گارڈ ہمارے انتظار میں تھی جو ہمیں جلال آباد لے گئی۔ وہ ہمیں مہمان بنانا چاہتے تھے لیکن ہم نے خواہش ظاہر کی کہ ہم کابل پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ وہاں شعبۂ تعلیم کے ذمہ داران سے رابطوں کی صورت بن سکے۔ چنانچہ گورنر صاحب کے معاون نے ہمیں اپنی گاڑی میں مع گارڈ بٹھایا اور خود کابل لے کر گئے اور وہاں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرانے کا انتظام کیا۔ وہاں رہائش اور کھانے کا بہترین انتظام تھا۔ سردی کی وجہ سے کمرے میں گرم اے سی (کنورٹر) ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ ہم جتنے دن وہاں رہے، خصوصی گاڑی مع اردو دان ڈرائیور ہمارے لیے موجود رہی اور جہاں جانا ہوتا وہاں لے جاتی۔

وہاں پہنچتے ہی اگلی صبح ایک صاحب ہمیں ملنے تشریف لائے اور ان سے پتا چلا کہ پشاور کے افغان کونسلر حافظ محب اللہ صاحب نے سراج الدین حقانی صاحب (جنہیں وہاں 'خلیفہ صاحب' کہا جاتا ہے اور جو معروف افغان مجاہد جلال الدین حقانی مرحوم کے صاحبزادے اور وزیر داخلہ ہیں) سے ہماری آمد کی بات کی تھی اور ان کے دفتر سے ان کی ڈیوٹی لگی تھی کہ وہ ہمارے لیے تعلیمی ملاقاتوں کا انتظام کریں۔ جمعہ کو چونکہ چھٹی تھی اور سرکاری دفتر بند تھے اور کسی ملاقات کا اہتمام نہ ہوسکتا تھا اس لیے منتظمین ہمیں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد ایک قریبی پکنک پوائنٹ پغمان لے گئے جو کابل کے نواح میں مزید اونچائی پر واقع ہے۔ وہاں قریبی پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی، جھرنے رواں تھے، خوب ٹھنڈ تھی اور بہت خوبصورت جگہ تھی۔

دوسرے دن علی الصبح ایک افغانی بھائی تشریف لائے اور تفصیل کے ساتھ ہمارا مدعا سنا۔ مَیں اصلاحِ تعلیم سے متعلق اپنی کتابوں کے کئی سیٹ ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اردو خوب جانتے تھے۔ انہوں نے ایک ایک کتاب دیکھی، ان کے ٹائٹل ملاحظہ کیے اور ان کی ورق گردانی کی اور ہمارا مقصد اچھی طرح سمجھ گئے۔ پھر انہوں نے جا کر شعبۂ تعلیم کے ذمہ داران سے ہمارے لیے ملاقاتوں کا بندوبست کیا۔

* ہماری پہلی ملاقات وزیر معارف (سکولز) مولوی حبیب اللہ آغا صاحب سے ہوئی جن کا تعلق قندھار سے ہے۔ یاد رہے کہ افغانستان میں سکول تعلیم بارہ سال کی ہے (چھ سال پرائمری کے، تین سال متوسطہ (یا ثانویہ کے) اور تین سال (اعلیٰ ثانوی کے)۔ مولوی حبیب اللہ صاحب نے دینی تعلیم کوئٹہ کے دینی مدارس سے حاصل کی تھی۔ ان کے مشیر تعلیم اور نائبین بھی موجود تھے۔ انہوں نے ہماری باتیں سنیں تو خوش ہوئے اور کہا کہ آپ اگر افغانستان میں سکول قائم کرنا چاہتے

ہیں تو جی بسم اللہ۔ ہم پورا تعاون کریں گے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ افغانستان میں تعلیم عام ہو اور ہم جتنے بھی مالی وسائل اس کے لیے مہیا کر سکتے ہیں، کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اگر مسلم حکومتیں یا پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے عوام اور فلاحی ادارے ہمارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے اور ہر طرح کا تعاون انہیں مہیا کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ افغانستان میں اس وقت ۱۲،۰۰۰ (بارہ ہزار) سکول کام کر رہے ہیں۔ افغانستان میں ۳۴ صوبے اور ۴۲۱ اضلاع ہیں جن میں سے ۲۰۰ اضلاع میں سکول موجود نہیں جس کی بڑی وجہ غربت اور پچھلے چالیس سال سے ملک میں جاری جنگ ہے کہ ہمیں پہلے روس اور پھر امریکہ و یورپ کے خلاف جہاد کرنا پڑا۔ ظاہر ہے ان حالات میں تعلیمی ترقی ممکن ہی نہ تھی۔

لڑکیوں کی ثانوی تعلیم پر پابندی کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس بارے میں مخالفین کا پروپیگنڈا زیادہ ہے جو حقائق پر مبنی نہیں۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ مالی مشکلات کی وجہ سے دیہات میں گرلز سکول کم ہیں اور تربیت یافتہ خواتین اساتذہ کی بھی کمی ہے۔ والدین اپنی جوان بچیوں کو دور دراز کے قصبات میں تنہا پیدل بھجوانے کو اچھا نہیں سمجھتے اور سواری ان کے پاس ہوتی نہیں۔ جوں ہی امارت کی مالی حالت اچھی ہوئی ہم بچیوں کے سکول قائم کریں گے اور ان کو تعلیم ان کی دہلیز پر مہیا کرنے کی کوشش کریں گے۔

نصاب کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ہمارے سکولوں کا نصاب اسلامی ہے۔ اشرف غنی حکومت نے جو نصابی کتب تیار کرائی تھیں، ہم نے ان پر نظر ثانی مکمل کر لی ہے لیکن ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ ہم نئی کتابیں طبع کر کے سکولوں کو بھجوا سکیں۔ اس لیے ہم نے یہ کیا ہے کہ سکولوں کو مطلع کر دیا ہے کہ فلاں فلاں اسباق میں غیر اسلامی مواد ہے انہیں نہ پڑھایا جائے۔

دینی مدارس بھی وزارت معارف کے ماتحت ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کے مدارس پاکستان کے دینی مدارس کے مقابلے میں چھوٹے ہیں اور ان کا معیار تعلیم بھی زیادہ بلند نہیں جس کی ایک وجہ موزوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کی کمی اور مخدوش مالی حالات ہیں۔ موقوف علیہ اور دورۂ حدیث کی اسناد حکومت کی منظور شدہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں مساجد اور مدارس کی بھی ضرورت ہے اور اس کے لیے، عالم اسلام اور پاکستان کے دینی عناصر اور فلاحی تنظیموں کے تعاون کو خوش آمدید کہیں گے۔

* ہماری دوسری اہم ملاقات مولانا ظاہر خان صاحب سے ہوئی جو وزارت اعلیٰ تعلیم کے نائب وزیر تھے اور وزیر اعلیٰ تعلیم مولانا ندا اللہ صاحب کی عدم موجودگی کی وجہ سے قائمقام وزیر تعلیم کی ذمہ داریاں نبھار ہے تھے۔ مولانا نے بتایا کہ انہوں نے دینی تعلیم جامعہ امداد العلوم پشاور اور مولانا حسن جان شہیدؒ سے حاصل کی اور ۱۵ سال تک پاکستانی اور افغانی مدارس میں حدیث پڑھاتے رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ افغانستان میں ۱۴۰ پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں جبکہ سرکاری یونیورسٹیاں ۶۰ ہیں۔ کابل شہر میں ۵۵ پرائیویٹ اور ۵ سرکاری یونیورسٹیاں ہیں۔ اکثر یونیورسٹیوں میں تعلیم بی ایس تک ہے۔ صرف بارہ یونیورسٹیوں میں ماسٹرز ڈگری اور صرف دو یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی سہولت موجود ہے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ افغانستان میں ایک قومی تعلیمی پالیسی موجود ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور یونیورسٹیوں کی نگرانی وزارت اعلیٰ تعلیم کرتی ہے جس کے تحت نصابات، مالیات، ہم نصابی سرگرمیوں وغیرہ کے لیے الگ الگ ڈائریکٹوریٹ قائم کیے گئے ہیں (اور ہماری طرح کا ہائر ایجوکیشن کمیشن موجود نہیں)۔ حکومتی یونیورسٹیوں کی طرح پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی نگرانی بھی حکومت کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یونیورسٹیوں کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے ہم نے ''ثقافت اسلامی'' کے نام سے ایک ٹاسک فورس قائم کی ہے جو سرکاری یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتی ہے۔ صرف کابل یونیورسٹی میں ''ثقافت اسلامی'' کے ۷۰ علماء کام کر رہے ہیں۔ اس سے یونیورسٹیوں کے ماحول کو اسلامی بنانے میں مدد ملی ہے اور ہماری اطلاع یہ ہے کہ اس سے متاثر ہو کر کئی اساتذہ نے اپنی وضع قطع اسلامی کر لی ہے۔

نصاب کے بارے میں ہمارے استفسار کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں یونیورسٹی کے نصابات اور ماحول پر اسلامی کلچر اور روایت کے گہرے اثرات موجود ہیں تاہم امریکہ ویورپ کے بیس سالہ اقتدار نے بلاشبہ ہماری اعلیٰ تعلیم پر برے اثرات ڈالے ہیں جس کے ازالے کے لیے ہم کوشاں ہیں۔

ہم نے کہا کہ ہم اپنے اصلاح تعلیم ٹرسٹ میں عمرانی علوم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا کچھ کام کر رہے ہیں (جسے عام لوگ Islamization of Social Sciences کہتے ہیں جبکہ ہم اسے Reconstruction of Social Sciences in Islamic Perspective کہتے ہیں کیونکہ ہمارے پیش نظر مغرب کے عمرانی علوم کو اسلام کے مطابق

ڈھالنا نہیں بلکہ اوریجنل تحقیق کے ذریعے اسلامی تناظر میں عمرانی علوم کی تشکیل نو اور تعمیر نو ہے) اور اگر وہ ہم آپ کو بھجوائیں تو کیا آپ اس سے استفادہ کرنا پسند کریں گے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں؟ ہم اس کا جائزہ لیں گے اور اگر ہم نے اسے مفید پایا تو ہم خوشی سے اس سے استفادہ کریں گے۔ آپ ہمیں یہ ضرور بھجوائیں اور اگر اس کے لیے مشترکہ تعلیمی سیمینارز وغیرہ کی ضرورت ہو تو ہم اس کے لیے بھی بخوشی حاضر ہیں۔ یہ تو ہمارے دل کی آواز ہے اور ہماری ضرورت ہے۔

انہوں نے کہا کہ ہم نے حال ہی میں کابل کی 'امریکی یونیورسٹی' کو 'افغان یونیورسٹی کابل' میں بدل دیا ہے۔ ہمیں اس کے لیے بہترین فیکلٹی کی تلاش ہے۔ اگر آپ اس میں بھی ہماری مدد کر سکیں تو ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔

ہم نے نوٹ کیا کہ وزارت معارف اور وزارت تعلیم میں دونوں جگہ ایک فارن افیئرز آفیسر مقرر ہیں جو غیر ملکی معاملات نمٹانے کے انچارج ہیں۔ وزارت معارف کے فارن افیئرز آفیسر سے جب ہم نے کہا کہ ہمیں افغان سکولوں میں پڑھائے جانے والی نصابی کتب کا ایک سیٹ مہیا کریں تاکہ ہم اس کی اسلامی تشکیل نو کی ضرورت وامکانات کا جائزہ لے سکیں تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں اس کے لیے ایک رسمی خط (Official Letter) لکھ دیں تو ہم آپ کو کتابیں بھجوا دیں گے۔ اسی طرح ہم نے وزارت اعلیٰ تعلیم کے فارن افیئرز آفیسر سے درخواست کی کہ ہم کابل کی بعض پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر یونیورسٹیوں کو وزٹ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہاں کے تعلیمی حالات کا جائزہ لے سکیں تو انہوں نے فوراً پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی فیڈریشن کے CEO جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب سے درخواست کی جنہوں نے دو پرائیویٹ سیکٹر یونیورسٹیوں کے وزٹ کا فوراً انتظام کر دیا۔ ہم ان کے دفتر گئے تو وہ ہمیں اپنے ہمراہ کابل میں خواتین کی واحد یونیورسٹی ''مورا'' لے گئے جس کا نیا نام بدل کر بی بی عائشہ یونیورسٹی رکھ دیا گیا ہے۔ اس یونیورسٹی کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایک میڈیکل ڈاکٹر عزیز الدین صاحب کی قائم کردہ نان کمرشل یونیورسٹی ہے۔ اس کا انفراسٹرکچر انتہائی اعلیٰ معیار کا ہے (جیسے لاہور میں لمز (LUMS) کا ہے) اور یہ وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے منتظم سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر آصف ننگ صاحب ہیں۔ جبکہ اس کی صدر اور ان کا سارا تعلیمی اور انتظامی عملہ خواتین پر مشتمل ہے۔ یونیورسٹی کی نائب صدر صاحبہ نے ہمیں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کا وزٹ کرایا۔ اس یونیورسٹی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ سکول بھی قائم ہے گویا اس میں پہلی جماعت سے پی ایچ ڈی تک کی تعلیم کا انتظام

ہے۔ فی الحال اس میں بی ایس تک تعلیم دی جارہی ہے اور طالبات کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں کیونکہ افغانستان میں ثانویہ تعلیم پر (عارضی) پابندی ہے اور انہوں نے فیس بھی رکھی ہوئی ہے تا کہ ادارہ اپنے اخراجات خود پورے کر سکے۔ ڈاکٹر آصف صاحب نے بتایا کہ ہم فیس زیادہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ افغانستان میں لوگوں کی معاشی حالت بہتر نہیں اس لیے ہمارے اخراجات پورے نہیں ہوتے اور خسارہ ڈاکٹر عزیز الدین صاحب اپنے پرائیویٹ ہسپتال کی آمدنی سے پورا کرتے ہیں جبکہ یونیورسٹی کمپلیکس بھی انہوں نے اپنے پرائیویٹ ہسپتال کی آمدنی اور اپنے بیرون ملک فیملی افراد کی اعانت سے تعمیر کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پرائیویٹ یونیورسٹی ہم پاکستانیوں کے لیے بھی باعث تقلید ہے کیونکہ ہمارے ہاں اکثر یونیورسٹیاں (بشمول مذہبی افراد کی قائم کردہ یونیورسٹیوں کے) کمرشل ہیں اور یار لوگ انہیں کاروبار کے طور پر چلا رہے ہیں۔

* دوسری یونیورسٹی جو ہم نے وزٹ کی وہ 'سلام یونیورسٹی' تھی۔ اس کے صدر ڈاکٹر مصباح اللہ عبدالباقی تھے (یاد رہے کہ افغانستان میں مردوں کے نام واحد نہیں ہوتے بلکہ عربوں کی طرح والد کا نام بھی ہر فرد کے نام کا جزء ہوتا ہے۔ اسی طرح عورتیں شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ خاوند کا نام نہیں لکھتیں بلکہ ان کے نام کے ساتھ ان کے والد کا نام برقرار رہتا ہے)۔ ڈاکٹر صاحب نے اعلیٰ تعلیم انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے حاصل کی اور یہیں ۱۸ سال تک تدریس بھی کی۔ انہوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تھیسز عربی زبان میں لکھے اور ان کی دو عربی کتابیں قاہرہ سے چھپی ہیں۔ وہ جدید اسلامی تحریک سے متاثر ہیں اگرچہ یونیورسٹی پر انہوں نے کوئی چھاپ نہیں لگنے دی۔ ان کے ہاں کمپیوٹر اور انجینئرنگ کے علاوہ بزنس اور اکنامکس کی فیکلٹیز موجود ہیں اور وہ یونیورسٹی کی مزید توسیع کے لیے کوشاں ہیں۔ ڈاکٹر مصباح صاحب نے ہمارے استفسار پر بتایا کہ وہ عمرانی علوم کی اسلامی تشکیل نو کے شدید خواہاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خود انہوں نے اکنامکس کے نصابات کو اسلامائیز کرنے کی کچھ کوشش کی ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اس پہ ابھی مزید محنت کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ دوسری جامعات میں اکنامکس، سوشیالوجی اور نفسیات وغیرہ کے عمرانی علوم کے نصابات خالصتاً مغرب زدہ ہیں اور ان کی اسلامی تشکیل نو کی شدید ضرورت ہے۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ اگر آپ اس سلسلے میں کام کریں تو ہم پورا تعاون کریں گے اور اگر مشترکہ کام کی ضرورت ہو تو ہم اس کے لیے بھی حاضر ہیں۔

* افغانستان کے سابق وزیر تعلیم مولانا عبدالباقی حقانی صاحب سے ہمیں طویل صحبت کا

موقع ملا۔ ہم ان سے اس لیے بھی ملنا چاہتے تھے کہ وہ دو ہفتے پہلے تک افغانستان کے وزیر اعلیٰ تعلیم تھے لہٰذا غیر رسمی طور پر انہوں نے ہمیں افغانستان کے نظام تعلیم کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ وہ روایتی عالم دین ہونے کے باوجود عصری حالات خصوصاً اسلام کی سیاسی فکر کے بارے میں واضح رائے رکھتے ہیں، دلائل کی بنیاد پر مغربی اور اسلامی جمہوریت کا ردّ کرتے ہیں، دینی مدارس میں اصلاح کے قائل ہیں اور ہماری طرح فرد کی تربیت کی اہمیت کے موید ہیں۔ صبح ناشتے پر ان سے ملاقات باہم دلچسپ رہی تو انہوں نے اصرار سے گھر پہ رات کھانے پر بلایا جہاں ان کی وسیع لائبریری ہے۔ وہیں ان سے دو تین گھنٹے بے تکلفی کے ماحول میں علمی اور فکری نشست رہی اور ہم نے ان کے علم وفضل سے استفادہ کیا۔ وہ جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں پڑھاتے رہے ہیں، اردو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن بولتے نہیں۔ ان کے شاگردوں اور متوسلین میں سے کئی افراد وہاں موجود تھے جو اردو اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے لہٰذا ہمیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

* ہمارے ہاں ایک عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ افغانستان ایک پسماندہ ملک ہے، جنگ سے کھنڈر بن چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہاں جا کر حالات دیکھیں تو حالات کہیں بہتر نظر آتے ہیں۔ ساری مشکلات کے باوجود وہاں کے معاشی حالات بہتر ہو رہے ہیں اس وقت افغانی روپیہ پاکستان کے ساڑھے تین روپے کے برابر ہے (اندازہ کیجیے پاکستان کی مالی حالت کا؟) ہم نے اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے پوچھا تو اس نے کہا کہ طالبان کے آنے کے بعد مہنگائی بتدریج کم ہو رہی ہے۔ افغان وزیر مالیات نے چند ماہ پیشتر پہلا سالانہ بجٹ پیش کیا تھا جو بلا سود تھا اور اس میں کوئی غیر ملکی امداد بھی شامل نہ تھی۔ اور اب وزارت مالیات داخلی آمدنی سے سرکاری ملازمین کی تنخواہیں پوری کر رہی ہے۔ نیز وہاں سے کرپشن، رشوت اور مالی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ملک میں امن وامان اور سیاسی ومعاشی استحکام ہے۔ کابل میں کثیر منزلہ پلازے، کھلی سڑکیں، کاروں کی کثرت، ٹریفک کا رش، بازاروں میں بھیڑ ایک آباد اور روبہ ترقی ماحول کی نوید دیتے ہیں۔

وہاں سرمایہ کاری اور تجارت کے فروغ کے بہترین امکانات موجود ہیں۔ ہماری کابل میں کراچی کے ایک مولانا صاحب سے ملاقات ہوئی جو جنوبی افریقہ کے مسلمان صنعتکاروں کے ایک گروپ کو لے کر کابل آئے ہوئے تھے اور وہاں اربوں روپے کی سرمایہ کاری کر رہے تھے (پن بجلی اور کوئلے سے بجلی بنانے کے کارخانے، گولڈ مائنز وغیرہ)۔ ہم پاکستانی تاجروں اور صنعتکاروں کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے کہ وہ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور مواقع سے

فائدہ اٹھائیں (دونوں طرف کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی پیشگی منظوری ضروری ہے کیونکہ افغانستان حال ہی میں بیس سالہ جنگ سے نکلا ہے اور ہزیمت خوردہ دشمن ابھی تاک میں ہے لہٰذا احتیاط واجب ہے)۔ ہم حکومت پاکستان سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ اپنا رویہ بدلے اور افغانستان میں موجود مواقع سے فائدہ اٹھائے۔ اگر انہوں نے یہ موقع ضائع کردیا اور افغان تجارت اور ترقیاتی سرگرمیوں پر بھارت، چین، ترکی یا کوئی دوسرا ملک غالب آ گیا تو پھر ہاتھ ملنے یا اعتراض کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

* پاکستان کے دینی مدارس سے پڑھے ہوئے مولوی صاحبان کو جب کابل میں وزارت کی مسند پر متمکن دیکھا تو ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ کیا یہ کامیاب لیڈر اور منتظم ثابت ہوں گے؟ کیا دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگ ایک جدید ریاست کا نظم ونسق چلا سکیں گے جن میں امور جہانبانی کا درس دیا ہی نہیں جاتا؟ ایک آدھ مقامی فرد نے بھی اس پر شک کا اظہار کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا جواب تو وقت ہی دے گا کیونکہ ابھی طالبان کو برسر اقتدار آئے سال ڈیڑھ ہی ہوا ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کی کامیابی کا امکان غالب ہے۔ ہم نے اپنی کتاب 'مسلم نشأۃ ثانیہ' میں مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ عرب کے رہنے والے اَن پڑھ بدوؤں نے کس طرح بیس سال سے کم عرصے میں دو سپر پاورز کو شکست دی اور ان کی جگہ کامیابی سے حکومت چلائی؟ اور اس کا عقلی جواب یہ دیا ہے کہ کسی نظریۂ حیات سے شدید وابستگی انسان کے اندر کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشتی اور ابھار دیتی ہے اور وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے، ہر مسئلہ حل کرسکتا ہے اور ہر چیلنج کا جواب دے سکتا ہے (ورنہ حضرت عمرؓ نے کسی یونیورسٹی سے پبلک ایڈمنسٹریشن کی ڈگری نہ لی تھی اور نہ حضرت عثمانؓ نے کامیاب تجارت کے گُر کسی انٹرنیشنل یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری سے سیکھے تھے جس طرح کہ ہم آج کل ضروری سمجھتے ہیں)۔ تو افغان جہاد نے ان افغانیوں کا بہترین تزکیہ کردیا ہے۔ اللہ کی راہ میں قربانیاں دینے، تکلیفیں برداشت کرنے اور موت کی خوشبو سونگھنے نے ان کے اندر کے فطری داعیات اور صلاحیتوں کو نکھار دیا ہے۔ ان کی ذہانت، فراست اور فطانت کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور وہ ان شاء اللہ ہر چیلنج سے نمٹنے کی صلاحیت اور قوت رکھتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے ہر معاملے میں کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ۔ [ان کو پاکستان کے علماء پر قیاس نہ کریں کیونکہ پاکستان کے علماء جہاد کے پروسیس سے نہیں گزرے۔ نہ انہوں نے اللہ کی راہ میں افغانیوں کی طرح جان ومال کی قربانیاں دی ہیں اور نہ تکلیفیں سہی ہیں لہٰذا ان کا افغان طالبان سے کیا موازنہ؟]۔

* **متفرق باتوں میں سے چند:** کابل کی سڑکیں کافی کھلی ہیں لیکن وہاں ہر وقت سڑکوں پر شدید رش رہتا ہے۔ گاڑیوں کی تعداد کافی ہے، پبلک ٹرانسپورٹ کم ہے۔ کابل شہر کے اندر اور شہروں کے درمیان چلنے والی کوئی بس ہمیں نظر نہیں آئی۔ طورخم پر سرحد کراس کرنے کے لیے بہت طویل گزرگاہ ہے جس کی افادیت ہم نہیں سمجھ سکے۔ افغانستان سے بہت سے لوگ پاکستان آنا (اور اس کے ذریعے دوسرے ممالک جانا) چاہتے ہیں اور دونوں ممالک (پاکستان اور افغانستان) اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ افغانستان میں علاج معالجے کا معیار بہت اونچا نہیں اور جو لوگ افورڈ کر سکتے ہیں وہ پیچیدہ امراض کے علاج کے لیے پشاور کا رُخ کرتے ہیں۔ افغانستان میں پاکستان کے دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل لوگوں کی کافی تعداد ہے اور اس کے مثبت اثرات بھی موجود ہیں۔ پشاور میں افغان کونسلر حافظ محب اللہ صاحب اصرار سے اپنے آپ کو مہاجرین اور پاکستانیوں کو انصار سے تشبیہ دیتے رہے اور پاکستان کے کردار کی تعریف کرتے رہے۔ اس کے باوجود افغانستان میں اور خصوصاً کابل میں اردو سے کام نہیں چلتا۔ ہمیں بھی بہت جگہ دقت کا سامنا کرنا پڑا اور مترجم کی ضرورت پڑی۔ بہت سے لوگ اردو سمجھ لیتے ہیں لیکن بول نہیں سکتے۔ انگریزی بھی وہاں کام نہیں آتی لہٰذا افغانستان جانے کی خواہش رکھنے والے اس بات کا لحاظ ضرور رکھیں۔ مساجد اور مدارس ہمیں وہاں کم نظر آئے۔ بل بورڈوں پر کہیں عورت کی تصویر بھی ہمیں نظر نہیں آئی۔ کابل چونکہ بلندی پر ہے اس لیے وہاں سردی زیادہ ہے۔ ہمارے قیام کے دوران بھی رات کے وقت سردی منفی صفر سے زیادہ ہوتی تھی۔ دن میں البتہ سردی کم تھی۔ دسمبر جنوری میں کابل میں برفباری بھی ہوتی ہے۔

لوگ شلوار قمیص پہنتے ہیں۔ سادگی طالبان قائدین کی عمومی صفت ہے۔ کسی وزیر اور افسر کی گردن میں ہمیں سریا نظر نہیں آیا۔ جن دونوں وزیروں سے ہم ملے وہ سفید لباس اور سادہ چپل پہنے ہوئے تھے (جس طرح کے سلیپر ہم گھروں میں پہنتے ہیں) اور وہ عام لوگوں سے گھل مل رہے تھے۔ سلام یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر مصباح صاحب کے دفتر میں ہم نماز پڑھنے لگے تو ہمارا ڈرائیور جو ہمارے ساتھ ان کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، وہ وضو کرنے کے لیے اٹھا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے واش روم کی طرف اس کی رہنمائی کی۔

افغانستان میں عورتیں آپ کو گھروں سے باہر سڑکوں بازاروں میں کم نظر آئیں گی۔ کابل میں پٹھانوں کا شٹل کاک روایتی برقعہ ہمیں شاذ ہی نظر آیا۔ ایجوکیشن یونیورسٹی کے باہر ہمیں لڑکے

اورلڑکیاں مقامی لباس کے علاوہ پینٹ کوٹ میں بھی نظر آئیں لیکن سکارف کے ساتھ۔ سڑک پر سفر کرتے ہوئے آپ اردگرد دیکھیں تو ماحول آپ کو پاکستان سے ملتا جلتا ہی نظر آئے گا خصوصاً جلال آباد تک کا ماحول پشاور جیسا لگتا ہے۔ اہل کابل کی خوراک میں گوشت بنیادی آئٹم ہے اور بیضوی شکل کا لمبا نان تینوں وقت کھایا جاتا ہے مع قہوہ کے۔ ہمارے ایک ساتھی نے ایک دفعہ چائے کا کہا تو چائے کا رنگ عجیب تھا پتا چلا کہ ایرانی پتی کی وجہ سے ہے اور ذائقہ بھی مختلف لگا۔

* ہم دو دن کا پلان بنا کر آئے تھے لیکن ہم کابل میں چار دن گزار چکے تھے (مزید ایک دن آنے کا اور ایک دن جانے کا) لہٰذا ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ منتظمین کو بتایا تو انہوں نے ہماری واپسی کا انتظام کیا اور آرمی کا گارڈ ہمیں لینڈ کروزر بلٹ پروف گاڑی میں طورخم تک چھوڑنے آیا۔ بارڈر کراس کرنے کی کاروائی انہوں نے دو منٹوں میں نمٹائی۔ دوسری طرف قونصلیٹ کی گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی اور رات گزارنے کے لیے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں انتظام تھا۔ یوں ہم ایک شاہانہ سفر کا تجربہ کرتے ہوئے، اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اور طالبان کی امارت اسلامیہ کے لیے دعا کرتے ہوئے گھر کو روانہ ہوئے۔ واپسی پر اکوڑہ خٹک رُک کر ہم نے مولانا راشد الحق صاحب اور مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کا بھی شکریہ ادا کیا کہ ان کی سرپرستی کی وجہ سے ہمارا دورہ کامیاب رہا اور ہمیں ہر جگہ تعاون ملا۔

ہم پاکستان اور عالم اسلام کے اہل دین اور ان کی فلاحی تنظیموں سے جو امارت اسلامیہ افغانستان کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ وہ مسلم نشأۃ ثانیہ میں اپنا کردار ادا کر سکے، درخواست کرتے ہیں کہ وہ افغان عوام اور حکمرانوں کی دامے دِرمے سخنے حمایت واعانت کریں خصوصاً تعلیمی میدان میں ان کی مدد کریں تا کہ افغانستان ایک مستحکم اسلامی معاشرہ اور مضبوط اسلامی ریاست بن کر اُبھرے اور امت کے لیے قائدانہ کردار ادا کر سکے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے بھی دعا گو ہیں کہ اے اللہ! افغانستان کو اسلام کا قلعہ بنا دے۔ اسے ایک کامیاب اور مستحکم مثالی اسلامی ریاست بنا دے تا کہ یہ عالم اسلام کی قیادت کرے، کفار کے ناپاک ارادے خاک میں ملا دے اور اعلائے کلمۃ اللہ کا علمبردار بنے۔ اے اللہ! اہل پاکستان کو بھی اسلام پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اس کی دینی وسیاسی قیادت کو بھی ہوش کے ناخن لینے کی توفیق ارزانی فرما تا کہ یہاں کے حالات بھی بہتر ہو سکیں۔ آمین، یا ربّ العٰلمین۔

تعلیم و تربیت ڈاکٹر عبدالحسیب مجاہد

پروفیسر محمد حسین ملکؒ کی یاد میں

نائب مدیر البرہان و معروف ماہر تعلیم کی برسی پر ان کے مجموعۂ مقالات کی تقریبِ رونمائی

ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر محمد حسین ملک مرحوم کی یاد میں اور ان کے مجموعہ مضامین ''مقالات تعلیم'' کی تعارفی تقریب منعقد کی گئی۔ تقریب میں معروف ماہرین تعلیم اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مصروف کار ان کے دوستوں اور شاگردوں نے شرکت کی۔ ڈائریکٹر ادارہ تعلیم و تحقیق پروفیسر رفاقت علی اکبر اس تقریب کے روح رواں تھے۔ ڈاکٹر محمد امین، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر سلیم منصور خالد، ڈاکٹر مہر محمد سعید اختر، پروفیسر محمد امیر ملک، پروفیسر ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر عبدالطیف چوہدری، پروفیسر عبد الغفور چوہدری، پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد اقبال، پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم خالد، پروفیسر عبداللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید شاہد، ڈاکٹر احمد شیر اعوان، ڈاکٹر شاہد فاروق، ڈاکٹر طارق چوہدری، ڈاکٹر محمد اکرم، یحییٰ رشید ایڈوکیٹ، پروفیسر ممتاز سالک ،ڈاکٹر شوکت علی رضا، سابق صدر سٹوڈنٹس یونین جامعہ پنجاب محترم اختر جاوید، شعبہ صحافت سے محترم تاثیر مصطفی، ان کے ایک پیارے شاگرد کفایت اللہ صاحب کے صاحبزادے سعید اللہ، ڈاکٹر ظہیر حسین شاہ، منیر حسین شاہ، آئی ای آر کے متعدد ملازمین اور پروفیسر محمد حسین ملک کے جملہ اہل خانہ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر فرخ منیر نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض بہت خوبصورتی سے انجام دیے۔

بادشاہی مسجد کے تراویح کے قاری جناب حافظ طیب حسن صاحب کی تلاوت سے تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ڈاکٹر فرخ منیر صاحبہ نے ملک صاحب کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ظہیر حسین صاحب نے فکر آخرت کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ موت اور زندگی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور اس عارضی زندگی کو ہمیں اخروی زندگی کا ایک پڑاؤ سمجھنا چاہیے اور آخری سفر کے مسافروں کے لیے دعا کا توشہ بھیجنا چاہیے۔ اگلے مقرر سعید اللہ صاحب تھے جو کفایت اللہ صاحبکے صاحبزادے ہیں جو ملک صاحب کے اس وقت کے شاگرد تھے جب وہ ساہیوال میں سکول ٹیچر تھے۔ سعید اللہ صاحب نے اپنے والد کے لکھے ہوئے خراج عقیدت کو پڑھا کیوں کہ وہ صاحب فراش ہونے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھے۔ کفایت اللہ صاحب

نے اپنے استادمحترم کے لیے بہترین خراج عقیدت لکھ کر بھیجا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ دوران تدریس جب ملک صاحب کا داخلہ ایم اے ایجوکیشن میں ہو گیا اور انہیں لاہور آنا پڑا تو ساہیوال میں کسی سائنس ٹیچر کا بندوبست نہ ہو سکا اور اس بات کا پتا جب ان کے استادمحترم کو چلا تو وہ ہر ویک اینڈ پر لاہور سے ساہیوال جاتے اور طلبہ کو ان دودنوں میں پڑھاتے اور انہوں نے نہ صرف کورس مکمل کروایا بلکہ دو دفعہ دوہرائی بھی کروائی اور سکول کا میٹرک کا رزلٹ سو فیصد رہا۔ انہوں نے لکھا کہ وہ اپنے استادمحترم کے''گڈ بوائے'' تھے اور ہمیشہ رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں آج بھی ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو اپنے شاگردوں کی تعلیم کے لیے اتنی فکر اور دردمندی رکھتے ہوں۔

اگلے مقرر جناب پروفیسر سلیم منصور خالد تھے۔ انہوں نے اختصار کے ساتھ ملک صاحب کی شخصی خوبیوں کا احاطہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ملک صاحب کی تحریر میں فصاحت اور بلاغت تھی اور لمبی بے مقصد تمہید کے بغیر اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا بیک گراونڈ چونکہ سائنس کا تھا اس لیے وہ تیز فہم تھے اور معاملات کو نہ صرف جلد سمجھنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے بلکہ اسے دلیل سے سمجھاتے بھی تھے۔ صاف گوئی اور سچائی ہمیشہ ان کا وصف رہا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ ایک وسیع المشرب آدمی تھے مگر انہوں نے ان تعلقات کو ہمیشہ نظام تعلیم کی بہتری کے لیے استعمال کیا اور اس سے کبھی کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔

اگلے مقرر جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب تھے جن کا ملک صاحب کے ساتھ تعلق تیس سال پر محیط ہے۔ ڈاکٹر صاحب ماہنامہ البرہان کے مدیر ہیں اور ملک صاحب دم واپسیں تک اس کے نائب مدیر رہے۔ ملک صاحب کا مجموعہ مضامین ''مقالات تعلیم'' بھی ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ہی مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ سنگل نیشنل کریکولم کے خلاف سب سے پہلی آواز ملک صاحب کی تھی اور پھر انہوں نے اس کو پورے ملک کی آواز بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی بات کو اگر اختصار سے بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ملک صاحب عمل کے آدمی تھے ۔ ملک میں جتنی بھی تعلیمی پالیسیاں بنی ہیں اور مرکز میں نصاب سازی کا کام ہوا ہے ان میں جتنا بھی اسلامی رنگ ہے وہ

زیادہ تر ملک صاحب کی مساعی کا نتیجہ ہے۔انہوں نے کہا کہ ملک صاحب نے جس طرح تعمیری انداز میں تعلیم کی بہتری کے لیے کوششیں کی ان کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر ملک محمد امیر صاحب نے مرحوم نے کے ساتھ اپنے ۵۴ سالہ تعلقات کی یادوں کو تازہ کیا اور فرمایا کہ ہماری ملاقات ۱۹۸۵ء میں ایک ریفریشر کورس کے دوران ہوئی اور پھر تحریکی طور پر ہم خیال اور جغرافیائی طور پر ہم علاقہ ہونے کی وجہ سے تعلقات میں گہرائی اور پختگی آتی چلی گئی۔ہم ایک دوسرے کی خوشی وغم میں شریک ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ باقی مقررین نے ان کی تحریر وتقریر کے حوالے سے گفتگو کی ہے مگر میں ان کی شخصیت کے حوالے سے کچھ عرض کروں گا۔ملک صاحب اعوان تھے اور اعوان اپنے مؤقف پر ڈٹ جانے والے لوگ ہوتے ہیں اور اس کے لیے وہ قربانیاں بھی دیتے ہیں۔انہوں نے ملک صاحب کے بچپن کے ایک واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سخت تنقید اور اپنے مؤقف پر ڈٹ جانے کے جس وصف کا تذکرہ کیا جارہا ہے اس کی بنیاد علمیت بھی تھی اور''اعوانیت'' بھی۔ جناب ملک امیر صاحب نے فرمایا کہ عام طور پر ہم پروفیسر شپ کو گریڈ اور عہدے سے منسوب کرتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کا تعلق علمیت سے ہے اور پروفیر محمد حسین ملک حقیقی معنوں میں پروفیسر تھے۔ان کی اور یجنیلیٹی ان کی پہچان تھی۔وہ ایک ہمدرد اور غمگسار آدمی تھے۔انہوں نے فرمایا کہ ان کے بیٹے ڈاکٹر حافظ حمید اللہ کی وفات پر ملک صاحب نے جس طرح غمگساری کی وہ قابل تعریف ہے۔

ڈاکٹر محمد سعید شاہد صاحب نے اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ملک صاحب کو ایک بامقصد زندگی گزارتے دیکھا اور دم واپسیں تک وہ اپنے اس مقصد سے جڑے رہے۔ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ان کی شخصیت کو اگر مختصر طور پر بیان کرنا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی نا خوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

انہوں نے کہا کہ اپنے اس وصف صاف گوئی و بے باکی کی وجہ سے وہ تنظیم اساتذہ میں میرے پسندیدہ ترین آدمی تھے اس لیے کہ انہوں نے حق پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔حق کے لیے ڈٹ جانا اب ناپید ہوتا جارہا ہے مگر ملک صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو ہمیشہ حق کے لیے لڑتے رہے۔انہوں نے کہا کہ ان کا دوسرا نمایاں وصف دوستوں اور عزیزوں کے لیے ان کی دردمندی،

ہمدردی اور غمگساری تھی۔ وہ مومنانہ بصیرت کے حامل تھے اور اس شعر کی عملی تفسیر تھے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

انہوں نے کہا کہ میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان سے سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ مفکر تعلیم بھی تھے اور متفکر تعلیم بھی اور ہمیشہ تعلیم کی بہتری کے لیے سوچتے رہے۔

ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی اردو کے پروفیسر ہیں اور ان کا تعلق ملک صاحب کے زمانہ طالب علمی سے تھا جب یہ دونوں سرگودھا کالج میں زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے اپنی یادوں کو کھنگالتے ہوئے بتایا کہ ان کے ادارے میں ان کے ساتھ سکولوں کے لیے نصابی کتب لکھنے کا کام بھی کیا اور اس دوران ان کی شخصیت کو پرکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر دم مستعد اور کمر بستہ رہتے اور کسی دباؤ میں آنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے اور اپنے عمل سے جو سبق انہوں نے دیا وہ یہ تھا کہ جس بات کو حق سمجھو اس پر ڈٹ جاؤ اور نتیجہ اللہ رب العزت پر چھوڑ دو۔

جناب یحییٰ رشید صاحب پیشے کے اعتبار سے ایک وکیل ہیں اور ملک صاحب سے ان کا تعلق آفاق کے لیگل ایڈوائزر کے طور پر شروع ہوا مگر یہ تعلق بعد میں محبت اور عقیدت کے رشتے میں ڈھل گیا۔ یحییٰ صاحب نے کہا کہ ملک صاحب ایک ماہر تعلیم تو تھے ہی مگر وہ ایک بہترین منتظم بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ بطور لیگل ایڈوائزر میرا تعلق بہت سی کمپنیوں کے ساتھ ہے اور ان کے افسران اعلیٰ کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے مگر معاملات کو سمجھنے کی اور سلجھانے کی جو صلاحیت ملک صاحب میں تھی اور کسی میں نہیں دیکھی۔ ۲۳ لاکھ کے قلیل سرمائے سے شروع ہونے والا آفاق ملک صاحب نے چند سالوں میں ۹ کروڑ کے منافع بخش ادارے کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی کا یہ واحد ادارہ تھا جو ملک صاحب کی وجہ سے منافع بخش ثابت ہوا۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے حسن صہیب مراد صاحب کی سربراہی میں کام کیا مگر مَیں یہ سمجھتا اور کہتا ہوں کہ آفاق میں حسن صہیب مراد نے ان کی سربراہی میں کام کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک مردم شناس آدمی تھے۔ لوگوں کے اندر کی صلاحیت اور کرنٹ کو پہچان لیتے تھے۔

انہوں نے کہا کہ ان کے ساتھ میرا تعلق ایک باپ اور بیٹے جیسا تھا اور میں اس تعلق کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔

اگلے مقرر جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب تھے۔ وہ خرابیٔ طبیعت کی وجہ سے زیادہ نہیں بول پائے مگر انہوں نے کہا کہ سرگودھا کالج کے زمانے سے وہ ملک صاحب کو جانتے ہیں اور یہ تعلق ان کے دم آخر تک برقرار رہا۔

ڈاکٹر مہر محمد سعید اختر صاحب نے فرمایا ملک صاحب کی سوچ عالمگیر تھی۔ وہ صرف پاکستان کے نصاب تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی نظر اور ان کا وژن لامحدود تھا۔ وہ مسائل و معاملات کو ہمیشہ عالمی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ذاتی زندگی میں وہ انتہائی سادہ اور مخلص انسان تھے۔ وہ ایک وسیع المشرب آدمی تھے اور ہر طبقۂ فکر کے لوگوں سے رابطے میں رہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے تھے لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی محبت سب کے لیے تھی۔ ان کی زندگی اس آیت مبارکہ کی عملی مثال تھی:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[الانعام ۶:۱۶۲]

انہوں نے کہا کہ میرا تعلق ان کے ساتھ آخری وقت تک برقرار رہا اور ۲۷/اکتوبر کو جب ہسپتال میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا تو مجھے یوں لگا جیسے کہہ رہے ہوں کہ مہر سعید میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا اب باقی کام تمہارے ذمہ ہے۔ اور اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ یہ مشن چھوٹنے نہ پائے۔

ملک اختر جاوید صاحب جو پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین کے سابق صدر ہیں ملک صاحب کے ہائی سکول خوشاب میں شاگرد رہ چکے ہیں، انہوں نے کہا کہ جس طرح اقبال نے کہا کہ ؎

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

اختر جاوید صاحب نے کہا کہ میں زندگی میں تین اساتذہ سے متاثر ہوا، ان میں ایک ملک صاحب تھے اور دوسرے ملک صاحب کے ماموں ملک امیر حسین صاحب۔ انہوں نے کہا کہ

بہت کم اساتذہ ہوتے ہیں جو اپنے شاگردوں کو اپنی رائے سے اختلاف کا حق دیتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسین ملک ان اساتذہ میں سے تھے جو نہ صرف اختلاف کا حق دیتے تھے بلکہ دلیل سے بات سمجھاتے بھی تھے۔ ان میں حق بات کہنے کا حوصلہ بھی تھا اور سننے کا بھی۔ انھوں نے کہا کہ ان کے استاد محترم 'خیر الناس من ینفع الناس' کی عملی تفسیر تھے وہ آسانیاں بانٹنے پر یقین رکھتے تھے۔ ان جیسے نایاب لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنی بات اس شعر پر ختم کی۔

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

اگلے مقرر سابق صدر تنظیم اساتذہ جناب ڈاکٹر میاں محمد اکرم تھے۔ انہوں نے کہا کہ ملک صاحب تنظیم اساتذہ کی چند بڑی اور نابغہ روزگار شخصیات میں سے تھے۔ ملک صاحب ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ کسی بھی تعلیمی مسئلے پر تنظیم اساتذہ کی طرف سے سب سے پہلے ایک مسکت اور بھرپور رائے کا اظہار ہونا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک صاحب نہ صرف ماہر نصابیات تھے بلکہ پالیسی سازی کے بھی ماہر تھے اور ہر نئی تعلیمی پالیسی پر انہوں نے اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا۔ ان کے ہر سطح پر تعلقات تھے اور وہ ایسا مواد مرکزی حکومت کے دفاتر سے بھی لینے میں کامیاب ہو جاتے تھے جو کسی کی بھی دسترس میں ہونا ممکن نہ ہوتا۔ سنگل نیشنل کریکولم پر انہوں نے تنظیم کو متحرک کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ سنگل نیشنل کریکولم اب جس شکل میں ہے یہ ملک صاحب کی اٹھائی ہوئی تحریک کا ہی نتیجہ ہے۔ تعلیمی پالیسیوں میں جتنا بھی اسلام نظر آتا ہے اس کے پیچھے تنظیم اساتذہ اور پروفیسر محمد حسین ملک صاحب کی کاوشیں رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ملک صاحب نہ صرف خود ذہنی طور پر بیدار تھے بلکہ وہ دوسروں کو بیدار رکھنے کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔

ڈاکٹر ممتاز سالک صاحب نے اپنی گفتگو کا آغاز اس شعر سے کیا۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

انہوں نے کہا کہ پروفیسر محمد حسین ملک اس شعر کی مکمل تفسیر تھے۔ وہ اپنی ذات میں پوری تحریک تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہر ایک نے ان کی حق گوئی کی تعریف کی لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کے اندر حق گوئی سہنے اور اختلاف کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم تھی۔ وہ دلیل سے بات کرتے اور دلیل سے مانتے تھے۔ دوسری خوبی جوان کا خاصہ تھی وہ تھی ہر سطح اور ہر طرح کے لوگوں سے رابطے۔ کسی بھی تعلیمی مسئلے کو وہ ہمہ پہلو دیکھتے اور مختلف ذرائع سے اس کو اپروچ کرتے۔ لوگ انہیں سخت نقاد کہتے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تلخ نوائی چمن کے لیے ضروری تھی۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

انہوں اپنی تقریر علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کی۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

سُرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تُو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

جناب تاثیر مصطفی صاحب نے جو پیشے کے لحاظ سے سینئر صحافی ہیں کہا کہ ملک صاحب سے میرا تعلق محفل میں موجود لوگوں میں دورانیے کے اعتبار سے شاید سب سے کم ہے لیکن اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ گہرائی کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ لگتا تھا کہ تحریر وتقریر کے زاویے سے پروفیسر محمد حسین ملک ابلاغیات کے آدمی تھے۔ ابلاغیات کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ بات اس انداز سے شروع کریں کہ لوگ آپ کو پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔ دوسرا یہ کہ آپ کی دلیل ایسی ہو کہ قاری آپ کے ساتھ ساتھ چلے اور ابلاغ ایسا ہو کہ اس کے دل میں اترتا چلا جائے اور وہ چاہے بھی تو اختلاف نہ کر پائے۔ ملک صاحب کی تحریر میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ دنیا مفاہمتوں پر چل رہی ہے مگر ملک صاحب مفاہمت کے آدمی نہ تھے۔

مفاہمت نہ سکھا جبرِ ناروا سے مجھے
مَیں سر بکف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے

ملک صاحب ایسی ہی شخصیت تھے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے میدان کا انتخاب کیا جو مشکل تو تھا مگر جس میں کام کرنے کی ضرورت تھی۔ ملک صاحب کی اپنی رگوں میں بھی کردار کی مستی موجود تھی اور وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل بھی کردار کی غازی بنے۔

ڈاکٹر حافظ محمد اقبال صاحب نے کہا کہ ان کا تعلق پروفیسر محمد حسین ملک سے چالیس سال پرانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میری پہلی ملاقات سیاسی تھی اور دوسری ملاقات ان کے ساتھ ایک ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں ہوئی جہاں ان کی انتظامی صلاحیتوں اور مردم شناسی کو سمجھنے کا موقع ملا۔ تیسرا تعارف ان کے ساتھ اکیڈمک تھا اور انہوں نے کہا کہ ملک صاحب کو جو دو مواقع ملے ایک یونیورسٹی آف بیروت اور دوسرا آسٹریلیا میں یونیسکو فیلوشپ، ان مواقع نے ان کے وژن کو ڈویلپ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ملک صاحب ایک وژنری آدمی تھے اور ان کا یہ وژن ہر تعلیمی پالیسی اور ایجوکیشنل ریفارم میں بروئے کار آتا رہا۔

ڈائریکٹر آئی ای آر پروفیسر ڈاکٹر رفاقت علی اکبر نے تقریب کے اختتام پر تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ رسمی طور پر تو مجھے صرف شکریہ ادا کرنا چاہیے مگر تذکرہ پروفیسر ملک محمد حسین کا ہے تو میں خود کو روک نہیں پایا۔ انہوں نے کہا کہ میں ملک صاحب کا براہ راست شاگرد ہوں اور اس سلسلے میں انہوں نے دو تین واقعات کا ذکر کیا۔ پہلا واقعہ انہوں نے یہ بیان کیا کہ ملک صاحب 'ایجوکیشنل سیمینار' کا مضمون پڑھا رہے تھے اور تمام طلبہ کو لکھنے کے لیے مختلف موضوعات دیے گئے۔ جو موضوع انہیں دیا گیا اس پر انہوں نے ایک کتاب کی سمری تیار کی اور کلاس میں پیش کر دی اور زورِ خطابت کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ انہیں بہت سراہا جائے گا، مگر ملک صاحب نے کہا کہ رفاقت علی اکبر! آپ نے اپنے زورِ خطابت سے اپنے کلاس فیلوز سے تعریف تو سمیٹ لی مگر آپ نے صرف ایک کتاب کی سمری بنائی ہے میں آپ کو فیل تو نہیں کرتا مگر آپ دوبارہ پریزنٹیشن دیں گے۔ انہوں نے ڈاکٹر ممتاز سالک کی اس بات کی تصدیق بھی کی کہ ملک صاحب اختلافی نکتہ نظر سننے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ سنگل نیشنل کریکولم کے سلسلے میں ملک صاحب کی تحریک پر آئی ای آر میں ایک نیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ملک صاحب ایک آئیڈیل استاد

تھے۔ کلاس کے اندر ان کے انداز تدریس میں ایک ٹھہراؤ اور سکون تھا جیسے سمندر پرسکون ہوتا ہے اور اس کی وجہ ان کی علمی گہرائی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ملک صاحب سے یہ سیکھا کہ آپ وہ جملہ بولیں کہ کوئی اس میں سے ایک لفظ نکالنا چاہے تو نکال نہ سکے اور ایک لفظ کا اضافہ کرنا چاہے تو بھی نہ کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک صاحب کے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہم دیہاتی لوگ ہیں اور ہم اپنے اساتذہ کو پیر اور ان کے گھرانے کو پیر گھرانہ مانتے ہیں۔ استاد سے محبت اور عقیدت کا اظہار اس سے بہتر پیرائے میں شاید ہی کیا جا سکتا ہو۔ ڈاکٹر رفاقت علی اکبر صاحب نے کتاب کا تعارف بھی پیش کیا۔ انہوں نے ڈاکٹر محمد امین صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا کہ ان کی کاوشوں سے ملک صاحب کے مضامین کا مجموعہ 'مقالات تعلیم' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ اس موقع پر بی ایس ایڈ کے طلبہ وطالبات کے لیے پروفیسر محمد حسین ملک گولڈ میڈل کا بھی اعلان کیا گیا۔

تقریب کے اختتام پر پروفیسر محمد حسین ملک کے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالحسیب مجاہد نے تمام شرکا اور مقررین کا شکریہ ادا کیا اور خاص طور پر ڈائریکٹر ادارہ تعلیم وتحقیق ڈاکٹر رفاقت علی اکبر صاحب اور ڈاکٹر فرخ منیر صاحبہ کا جنہوں نے اتنی محبت سے اس پروگرام کا اہتمام کیا۔ تمام شرکا کو ملک صاحب کی 'مقالات تعلیم' تحفتاً پیش کی گئی۔ تقریب کے آخر میں ملک صاحب مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

---

۸ لاکھ مسلمان لڑکیاں ہندو لڑکوں سے شادی کر کے مرتد ہو چکی ہیں

معروف بھارتی عالم دین مولانا سجاد نعمانی کے سوشل میڈیا پر بیانات کے مطابق متعصب ہندو تنظیم راشٹریا سیوک سنگھ نے ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت اربوں کا بجٹ ان ہندو نوجوانوں کے لیے قائم کیا ہے جو مسلمان لڑکیوں کو ورغلا کر ان سے شادی کریں۔ ہر ایسے ہندو کو ڈھائی لاکھ روپے نقد دیئے جاتے ہیں، گھر دیا جاتا ہے اور ملازمت دی جاتی ہے اور انہیں اس غرض سے چھ ماہ کا کورس کرایا جاتا ہے۔ اس لالچ کی وجہ سے ہندو نوجوان دھڑا دھڑ مسلمان لڑکیوں کو ورغلا کر ان سے شادی کر رہے ہیں اور مولانا کے بقول ۸ لاکھ مسلمان لڑکیاں ہندو لڑکوں سے شادی کر چکی ہیں اور مرتد ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بھارتی مسلمانوں کو جھنجھوڑا ہے کہ وہ خواب غفلت سے جاگیں اور اپنی نسلوں کو ہندوازم میں ضم ہونے سے بچائیں۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

تربیت۔تعلیم سے زیادہ اہم ہے

انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز پشاور کے زیر اہتمام 'کردار سازی بذریعہ تعلیم'
کے موضوع پر پشاور یونیورسٹی میں سمینار سے مدیر البرہان کا خطاب

کردار سازی، تربیت اور تزکیۂ نفس کا مفہوم

انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد اقبال خلیل صاحب اور ان کے رفقاء مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس موضوع کو اہمیت دی اور اس پر سیمینار منعقد کیا۔

کردار سازی کا دوسرا عنوان ہے تعمیر سیرت اور تعمیر شخصیت۔ اسے اہل تعلیم 'تربیت' کہتے ہیں جبکہ اس کے لیے قرآنی اصطلاح 'تزکیۂ نفس' ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب ہے نفس کی ایسی تربیت کہ وہ برے میلانات، غلط رجحانات اور غیر فطری داعیات سے پاک ہو جائے اور اس میں نیکی کا میلان، اچھی صفات اور تعمیری رجحانات پروان چڑھیں۔ صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ اچھا کیا ہے اور برا کیا؟ خیر کیا ہے اور شر کیا؟ چونکہ ہم مسلمان ہیں اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ خیر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ خیر کہیں اور شر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ شر کہیں۔ اچھا عمل وہ ہے جسے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہو اور برا وہ ہے جسے کرنے سے اللہ نے منع کیا ہو۔ گویا تزکیۂ نفس کا مطلب ہے نفس کی ایسی تربیت کرنا کہ آدمی اللہ کے بتائے ہوئے اوامر پر عمل کر سکے اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے، ان کے کرنے سے باز آ جائے۔ اس بات کو محقق صوفیاء یوں کہتے ہیں کہ تزکیہ سے مقصود یہ ہے کہ ''شریعت طبیعت بن جائے''، یعنی نفس کی ایسی تربیت کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا اسے مرغوب ہو جائے اور معصیت سے اسے نفرت ہو جائے۔ اس بات کو نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا کہ مومن وہ ہے جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے۔ یعنی نماز سے اسے محبت ہو جائے۔ ایک نماز سے فارغ ہو تو اس کی خواہش ہو کہ جلد دوسری نماز کا وقت ہو تا کہ وہ مسجد میں آئے اور اپنے محبوب (اللہ) سے سرگوشیاں کرے۔

کردار سازی، تربیت اور تزکیۂ نفس کی اہمیت

یہ سمجھنے کے بعد کہ کردار سازی، تربیت اور تزکیۂ نفس ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں اور

یہ کہ اس سے مقصود انسانی شخصیت کی ایسی تعمیر ہے جس سے انسان کا اچھا کردار، اس کی خوبیاں اور نیکیاں پروان چڑھیں اور اس کی برائیاں، خامیاں اور معصیت کا رجحان کمزور پڑے، اب یہ سمجھ لیجیے کہ تعمیرِ شخصیت کے اس پروسیس یعنی تزکیۂ نفس کی دین میں بنیادی اہمیت ہے۔ دیکھا جائے تو یہ دین کی بنیاد ہے، یہ اس کا وہ ستون ہے جس پر دین کی ساری عمارت کھڑی ہے۔ اور یہ کہ تزکیۂ نفس کا بنیادی ذریعہ ہے تعلیم۔ تعلیم کا لفظ آج کل ہم ریگولر تعلیم، رسمی تعلیم اور نظامِ تعلیم کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن قرآن حکیم اسے اس کے وسیع مفہوم میں استعمال کرتا ہے یعنی تعلیم سے مراد ہے علم کا ابلاغ۔ قرآن اس کے لیے تعلیم کے علاوہ دعوت، تبلیغ، انذار، امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے جنہیں ہم آج کل کی اصطلاح میں غیر رسمی تعلیم کہتے ہیں۔

صحیح تعلیم وتزکیہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ قرآن حکیم نے اسے پیغمبروں کا بنیادی کام قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ۹۵۰ سال تک قوم کو حق کی دعوت دی[۱]۔ حضرت موسیٰ ؑ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمانے کے بعد حکم دیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اسے نرمی اور محبت سے دین کی تعلیم دو[۲] اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں چار دفعہ فرمایا کہ آپ کا بنیادی کام تعلیم کتاب وحکمت ہے[۳] یعنی کتاب (قرآن) کی تعلیم جو ہدایت کا بنیادی منبع ہے[۴] اور ایسی تعلیم جو قرآن کی روشنی میں انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھائے[۵]۔ بلکہ تزکیۂ نفس کا بنیادی ذریعہ چونکہ تعلیم ہی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں انبیاءِ کرام کا طریق کار بتایا وہاں تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ذکر بھی کیا اور الگ سے بھی تزکیۂ نفس کی اہمیت واضح کی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ:

- حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ ؑ کے صحیفوں میں تزکیہ کی اہمیت بتائی گئی تھی

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿١٥﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾

---

[۱] العنکبوت ۲۹:۱۴

[۲] طٰہٰ ۲۰:۴۳، ۴۴

[۳] البقرہ ۲:۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳:۱۶۴، الجمعہ ۶۲:۲

[۴] البقرہ ۲:۴

[۵] البقرہ ۲:۳۸

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝﴾ (۱)

''فلاح اُس نے پائی ہے جس نے پاکیزگی اختیار کی، اور اپنے پرودگار کا نام لیا، اور نماز پڑھی۔ لیکن تم لوگ دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو، حالانکہ آخرت کہیں زیادہ بہتر اور کہیں زیادہ پائیدار ہے۔ یہ بات یقیناً پچھلے آسمانی صحیفوں میں بھی درج ہے۔ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔''

۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اسے تزکیہ (احکام الٰہی کے مطابق پاکیزہ زندگی گزارنے) کی دعوت دو۔

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝﴾ (۲)

۔ اور نبی کریم ﷺ کو تعلیم کتاب وحکمت کے ساتھ تزکیہ کا بھی حکم دیا۔

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (۳)

''اور ہمارے پروردگار ان میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے جس کی حکمت بھی کامل۔''

بلکہ ایک جگہ تزکیہ کا ذکر تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے کیا (البقرہ ۲:۱۵۱) اور دوسری جگہ اس کے بعد کیا (البقرہ ۲:۱۲۹) جو اس بات کا قرینہ ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت سے مقصود ہر حال میں اور اوّل وآخر تزکیۂ نفس ہی ہے۔

بلکہ واضح فرمایا کہ فلاح اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا مدار تزکیۂ نفس ہی پر ہے۔

۔ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ (۴)

---

(۱) الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹

(۲) النازعات ۷۹: ۱۷، ۱۸

(۳) البقرہ ۲: ۱۲۹

(۴) الشمس ۹۱: ۹، ۱۰

''فلاح اُسے ملے گی جو اس (نفس) کا تزکیہ کرے اور نامراد وہ ہوگا جو اس کو (گناہ) میں دھنسا دے۔''

۔ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾[1]

''فلاح اُس نے پائی جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔''

اور اس کی وجہ بھی قرآن حکیم نے صاف بتادی کہ انسان کی ہدایت، کامیابی اور اخروی نجات کا انحصار اور دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اور کسی انسان کو ایمان نصیب نہیں ہوسکتا جب تک اس تک صحیح علم نہ پہنچے اور اس ایمان کے مطابق وہ عمل نہ کرنے لگے۔ اسی لیے قرآن حکیم یہ بات بار بار واضح کرتا ہے کہ دنیوی اور اخروی کامیابی کا انحصار ایمان وعمل صالح پر ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴾[2]

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ بے شک ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔''

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ﴾[3]

''البتہ جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے نعمتوں کے باغات ہیں۔''

یہ بھی یاد رہے کہ علم سے مراد علم ہدایت بھی ہے اور علم دنیا بھی بلکہ دین وشریعت تو کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزاری جائے چنانچہ دیکھیے کہ تخلیق آدم کے وقت جہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴾[4] کہہ کر بتایا کہ اس نے آدم کو دنیا کا علم عطا فرمایا، وہیں اس سلسلۂ کلام میں چند آیات کے بعد فرمایا ﴿فَاِمَّا

---

[1] الاعلیٰ ۸۷: ۱۴

[2] البینہ ۹۸: ۷

[3] لقمان ۳۱: ۸

[4] البقرہ ۲: ۳۱

يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾[1] یعنی انسان کی دنیاوآخرت میں کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق گزارے کیونکہ دنیا میں ہدایت الٰہی سے منہ موڑنے کا نتیجہ ہے بے اطمینانی کی زندگی، دنیا میں تنگی اور آخرت میں ناکامی۔ اور ہدایت الٰہی پر عمل کا نتیجہ ہے دنیاوآخرت دونوں میں کامیابی یا قلیل ہونے کی صورت میں دنیا میں سکون واطمینان کی زندگی اور آخرت کی کامیابی۔ اور اس کا زاد راہ ہے تعلیم وتزکیہ اور ایمان وعمل صالح۔

موجودہ تعلیم اور کردار سازی سے محرومی

سطور بالا کی مختصر بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک مسلمان کی دنیاوآخرت میں کامیابی کا نسخہ ہے صحیح تعلیم وتربیت (جسے آپ کردار سازی یا تزکیۂ نفس بھی کہہ سکتے ہیں) اور آج اگر ہمارا معاشرہ اخلاقی بحران کا شکار ہے اور ہماری اکثریت دین سے دور ہورہی ہے تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آج ہماری تعلیم بھی ناقص ہے اور نظام تربیت بھی۔

چونکہ اس وقت زیر بحث جدید عصری تعلیم ہے یعنی سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری عصری تعلیم میں نہ تو قرآن حکیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور نہ عقلی وسائنسی علوم قرآن حکیم کی روشنی میں مدون کیے گئے ہیں اور جب تعلیم ہی صحیح نہیں ہے تو نظامِ تربیت وکردار سازی کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ لہٰذا ہماری جدید تعلیم مغرب زدہ ہے بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ یہ مغرب کی الحادی فکروتہذیب کا بھونڈا چربہ ہے۔ یہ منافقت پر مبنی ہے، یہ ہمیں مغربی فکروتہذیب سے مرعوبیت سکھاتی ہے اور گو اس میں عوام اور علماء کے دباؤ پر اسلام کا معمولی سا تڑکا بھی لگایا گیا ہے لیکن وہ غیر مؤثر ہے بلکہ اس سے وہ جمع اضداد بن چکی ہے اور عملاً اس پر غلبہ مغرب کے الحادی افکار وعلوم کا ہے لہٰذا یہ مسلمانوں میں فکری انتشار اور عدم یکسوئی کا سبب بنی ہے جس کا لازمی نتیجہ ہے بے کرداری اور یہی ہمارے معاشرے میں اخلاقی بے راہروی کا بنیادی سبب ہے۔

اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علماء کرام کو اور ہمارے دینی عناصر کو اس مغرب زدہ جدید تعلیم کی اصلاح کی کوئی فکر نہیں۔ ان کے پاس اس کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں، وہ اس کے

---

[1] البقرہ ۲:۳۸

لیے کچھ کرنے کو تیار نہیں بلکہ صدمے اور دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری دینی جماعتوں کے افراد، کارکن بلکہ رہنما بھی جدید تعلیم کو کاروبار سمجھتے ہیں اور اسے کاروبار سمجھ کر کر رہے ہیں۔ان کو احساس ہی نہیں کہ اسلام میں تعلیم وتربیت کا تصور تو دعوت واصلاح کا تصور ہے۔ ہمارا ہر تعلیمی ادارہ اسلام کا مرکز اور قلعہ ہونا چاہیے تھا۔ اسے دعوت واصلاح کا مرکز ہونا چاہیے تھا جبکہ انہوں نے اسے محض کاروبار بنا دیا ہے اور کاروبار بھی ایسا جس میں ہدف زیادہ سے زیادہ مال کمانا ہے نہ کہ مسلمان بچوں کو صحیح علم دینا اور ان کی تربیت کرنا۔ تو ہم کس کو الزام دیں کہ جرم تو ہم خود کر رہے ہیں۔

تربیت کا منہج اور طریق کار

اگر آپ کے پیش نظر موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح، طلبہ کی کردار سازی اور اسلامی تربیت ہو تو ہم اس کے لیے آپ کے سامنے تین نکاتی لائحہ عمل رکھیں گے۔

ایک: یہ کہ آپ علوم کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کے لیے ایک علمی وتحقیقی ادارہ قائم کریں۔ یہ ادارہ اجتہادی نقطۂ نظر سے علوم کی تشکیل نو کرے۔ مغرب کی نقالی سے باز رہے اور قرآن وسنت کی روشنی میں، امت کے علمی وتہذیبی ورثے سے استفادہ کرتے ہوئے عصری مسائل و مشکلات کا حل پیش کرے۔ ان علوم کی بنیاد پر ہر سطح کی نصابی کتابیں مدون کی جائیں اور تعلیمی اداروں میں رائج کی جائیں۔

دوسرے: طلبہ کی کردار سازی اور اسلامی خطوط پر تربیت کے لیے دو کام کیے جائیں۔ ایک یہ کہ تربیت اساتذہ کے موجودہ منہج پر نظر ثانی کی جائے اور اس میں پیشہ ورانہ تربیت کے علاوہ دو باتوں کو اہمیت دی جائے۔ ایک یہ کہ ہر استاد خود اچھا مسلمان کیسے بنے اور اپنی اصلاح کیسے کرے؟ کیونکہ اگر استاد اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا نہ ہو تو بچوں کی اسلامی تربیت کر ہی نہیں سکتا کیونکہ بچے عمل کو دیکھتے ہیں گفتار کو نہیں۔ دوسرے یہ کہ اسے یہ ہنر سکھایا جائے کہ اپنے طلبہ کو اچھا مسلمان کیسے بنانا ہے؟ بچوں کو اچھا باعمل مسلمان بنانا یا کسی معصیت زدہ مسلمان کو صالح مسلمان بنانا ایک مشکل کام ہے۔ یہ ایک باقاعدہ فن ہے اور ہمارے اسلاف نے اس پر بہت کام کیا ہے۔ اس کام کو آج کے تعلیمی وتربیتی نظام میں ڈھالنا ایک بڑا چیلنج ہے جو ذہانت، محنت وکوشش، تحقیق اور مشقت کا متقاضی ہے۔

تیسرے: جس طرح تعلیمی ادارے میں تعلیم وتدریس ایک بنیادی سرگرمی ہے، اسی طرح تربیت طلبہ بھی ہر تعلیمی ادارے کے لیے ایک اہم اور بنیادی سرگرمی ہونی چاہیے۔ اس کا نصاب بنناچاہیے، اس کے لیے مربی ہونے چاہئیں۔ ہر تعلیمی ادارے بلکہ تعلیمی ادارے کی ہر کلاس میں ایک تربیت کمیٹی ہونی چاہیے۔ ہر تعلیمی ادارے میں ایک مرکزی تربیت کمیٹی ہونی چاہیےاور پھر ہر کلاس میں ایک ذیلی کمیٹی۔ مرکزی تربیت کمیٹی کوسالانہ اور ماہانہ بنیادوں پر تربیتی سرگرمیوں کا تعین کرنا چاہیے۔ اہداف مقرر کرنے چاہئیں اور ان کے حصول کے لیے کوششیں کرنی چاہئیں۔ ان سرگرمیوں کی جانچ (Evaluation) کا طریقہ بھی وضع کرنا چاہیے بلکہ ہماری تجویز یہ ہے کہ بطور سمبل تربیت کے ۱۰۰ نمبر مقرر کرنے چاہئیں اور اس میں پاس ہونا ہر طالب علم کے لیے لازمی ہونا چاہیے۔

مَیں آخر میں دینی عناصر کو درد دِل کے ساتھ اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی کریں۔ تعلیم وتزکیہ کو اس میں بنیادی اہمیت دیں۔ موجودہ نظام تعلیم وتربیت کی اصلاح کریں، اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالیں۔ ان کا ہر تعلیمی ادارہ دعوت واصلاح کا مرکز ہونا چاہیے۔ وہ لوگوں کی تعمیر سیرت کا کام کریں، ان کی کردار سازی کریں کیونکہ جب تک فرد کی اصلاح نہ ہو، معاشرے اور ریاست کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے؟ کیونکہ معاشرہ اور ریاست تو افراد ہی سے مل کر بنتے ہیں اور انہیں افراد ہی چلاتے ہیں۔

آخر میں تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ میں اور میرے ساتھی پچھلے ۳۵ سال سے اصلاح تعلیم کا کام کررہے ہیں۔ جدید نظام تعلیم کی اسلامی تناظر میں اصلاح اور تعلیم وتربیت کی اسلامی تشکیل نو پر میری ایک درجن کے قریب کتابیں موجود ہیں۔ ہمارا ماہنامہ البرہان بھی ہر ماہ تعلیمی اصلاح پر وقیع مضامین شائع کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر آپ موجودہ نظام تعلیم وتربیت کی اسلامی تناظر میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں یا اپنے تعلیمی اداروں کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس بارے میں نظریاتی رہنمائی کا مکمل سامان ہمارے لٹریچر میں موجود ہے اور اس سے آپ استفادہ کرسکتے ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین۔

تعلیم و تربیت وجیہ احمد صدیقی

تہذیبی خود کشی

اردو کو ذریعۂ تعلیم نہ بنا کر ہم اپنا بہت بڑا نقصان کر رہے ہیں

ملک کی ایک بڑی انجینئرنگ یونیورسٹی کے چانسلر اپنا سر پکڑے بیٹھے تھے کہ ان کی یونیورسٹی طالب علموں کو جدید ترین آلات، اعلیٰ نصاب اور بیرون ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آنے والے اساتذہ بھی محنت کے ساتھ پڑھا رہے ہیں لیکن وہ معیار حاصل نہیں ہو رہا ہے جو ان مضامین کی سند کے عالمی طور پر تسلیم کرنے کے لیے درکار ہے اور ان کا کہنا تھا کہ ان سے خود طالب علموں نے یہ شکوہ کیا ہے کہ انگریزی میں پڑھائے جانے کی وجہ سے نہ ان کی سمجھ میں نفس مضمون (Content) آتا ہے اور نہ ہی انہیں انگریزی زبان پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں یا انگریزی کی؟ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں یا انگریزی ادب میں مہارت کی سند لینے آئے ہیں؟ ان طالب علموں کا زیادہ وقت انگریزی گرامر سیکھنے میں لگ جاتا ہے اس کے نتیجے میں وہ اپنے اصل مضمون کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کا نظام تعلیم پاکستان کے لیے ماہرین اور ہنر مند تیار نہیں کر رہا ہے ہماری ساری محنت مغرب اور دیگر ممالک کے لیے ذہنی اور جسمانی غلام تیار کرنا ہے کیونکہ اس نظام سے فارغ التحصیل طلبہ کی سب سے بڑی دلچسپی یہ ہوتی ہے کہ انہیں بیرون ملک ملازمت اور وہاں کی شہریت مل جائے۔

بظاہر ہائر ایجوکیشن کمیشن کے نیشنل کوالی فیکیشن فریم ورک آف پاکستان 2015ء کی پالیسی میں بہ زبان انگریزی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اردو اور انگریزی کا ''فنکشنل نالج'' ہونا ضروری ہے۔ خیالات اور تصورات کی منتقلی کے لیے اردو اور انگریزی کی عملی معلومات ہونا ضروری ہے۔ نظریات (تھیوری) اور تصورات کی منتقلی کے لیے اردو اور انگریزی میں مہارت ضروری ہے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اردو اور انگریزی کی پیشہ ورانہ مہارت ضروری ہے''۔ غرض ہر جگہ یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ تعلیم کے حصول کے لیے اردو اور انگریزی کی مہارت مساوی طور پر ضروری ہے۔ لیکن جہاں یہ پالیسی بیان کی گئی ہے وہاں یہ شرط بھی عائد کی گئی ہے کہ اگر طالب علم نے اپنے امتحانی پرچے میں جواب انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں

دیا ہے تو اس کی سند/ ڈگری/ سرٹیفکیٹ اور کسی بھی دستاویز پر یہ واضح کیا جائے گا کہ اس نے کس زبان میں جواب دیا۔ اگرچہ ہر جگہ ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو کا مساویانہ ذکر ہے، لیکن انگریزی زبان کو مستند گردانا گیا ہے۔ لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ ایچ ای سی کی جانب سے ملک بھر کی جامعات میں حکماً انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں تدریس پر پابندی ہے، یہاں تک کہ وفاقی اردو یونیورسٹی میں گریجویشن اور ماسٹرز کے لیے بھی ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہے۔ جو یونیورسٹی کے چارٹر کی بھی خلاف ورزی ہے یہاں تک کہ وہاں اسلامیات کی تدریس بھی انگریزی زبان میں ہو رہی ہے۔ ہر یونیورسٹی میں کوالٹی کنٹرول کے نام پر ایچ ای سی کا ایک نمائندہ موجود ہوتا ہے جو یہ دیکھ کر کہ اگر تدریس کا کام اردو میں ہو رہا ہے تعلیم اور تدریس کو فوری طور پر غیر معیاری قرار دے دیتا ہے۔ اردو میں لیکچرز کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ جبکہ آئین پاکستان اور خود عدالت عظمیٰ کا فیصلہ پاکستان میں اردو کے سرکاری زبان کے طور پر مکمل نفاذ کا حکم دیتا ہے جس میں اردو زبان کے ذریعہ تعلیم کے طور پر نفاذ بھی شامل ہے۔ 1973ء کے آئین کا تقاضا تھا کہ 1988ء میں سرکاری زبان کے طور پر اردو کا نفاذ کر دیا جاتا کیونکہ دستور پاکستان کے آرٹیکل 251 کے مطابق:

''۱۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور یوم آغاز سے پندرہ برس کے اندر اندر اس کو سرکاری و دیگر اغراض کے لیے استعمال کرنے کے انتظامات کیے جائیں گے۔

۲۔ شق 1 کے تابع، انگریزی زبان اس وقت تک سرکاری اغراض کے لیے استعمال کی جاسکے گی، جب تک کہ اس کے اردو سے تبدیل کرنے کے انتظامات نہ ہو جائیں۔

۳۔ قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کیے بغیر، کوئی صوبائی اسمبلی قانون کے ذریعہ قومی زبان کے علاوہ کسی صوبائی زبان کی تعلیم، ترقی اور اس کے استعمال کے لیے اقدامات تجویز کر سکے گی''۔

آئین کا یہ آرٹیکل عوام کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کریں اور یہ جان سکیں کہ ان کے جج کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ ان کی نوکر شاہی (بیوروکریسی) کس طرح قواعد و ضوابط کے ساتھ کھیلتی ہے! لیکن عوام کے اس حق کے حصول کے لیے کسی بھی سیاسی جماعت نے آئین کے اس حکم پر عمل درآمد نہیں کیا اور نہ ہی کسی بھی سیاسی جماعت کے انتخابی منشور کا یہ حصہ رہا ہے کہ آئین کے اس آرٹیکل پر عمل درآمد کروایا جائے گا حالانکہ اس پر عمل درآمد کے لیے کسی آئینی ترمیم کی مزید ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کے لحاظ سے مکمل طور پر نافذ

کرنا پاکستان کے بیس بائیس کروڑ عوام کا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جمہوری اور قانونی استحقاق بھی ہے۔یقین نہ آئے تو اردو کے حق میں رائے دہی کرا کے دیکھ لیں۔بیوروکریسی تو یہ نہیں چاہے گی کہ انگریزی زبان سے نجات ملے۔کیونکہ اردو میں دفتری کارروائی سے ان کی ساری بدعنوانیاں عیاں ہوجائیں گی۔محض انگریزی زبان کی وجہ سے سرکاری ملازمین میں ایک احساس تفاخر پیدا ہوجاتا ہے۔

ہمارے ایک دوست جنہوں نے ارضیات میں ایم ایس سی کیا تھا لیکن سی ایس ایس کر کے اقتصادیات کی سند رکھے بغیر ڈپٹی آڈیٹر جنرل کی پوسٹ پر پہنچ گئے حالانکہ وہ آڈٹ کی الف بے سے بھی ناواقف تھے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے دفتری حریفوں سے انتقام لینا شروع کر دیا۔ ہر ایک کے خلاف الٹی سیدھی رپورٹیں جاری کر دیں۔محض انگریزی کے زور پر وہ اس عہدے تک پہنچے۔انگریزی کا اتنا زعم تھا کہ جب ریٹائرڈ ہوئے تو اسی دعوے پر ایک نجی یونیورسٹی میں صحافت کی تعلیم دینے لگے جبکہ صحافت میں ان کا یہ حال تھا کہ ان کے قلم سے کوئی مضمون غلطی سے بھی سرزد نہیں ہوا تھا۔ مجھے تو اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ذوق انتخاب پر افسوس ہوا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ دفتری انگریزی کے ماہر تھے جس کی بنا پر ان کو یہ زعم ہے کہ آڈٹ ہو یا اقتصادیات کا علم ہو یا ابلاغیات کی تدریس یہ سب ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔یہی کچھ کھیل ایچ ای سی میں ہو رہا ہے۔وہاں اعلیٰ تدریس کا معیار انگریزی میں تدریس ہے چاہے طالب علم کی سمجھ میں کچھ آئے یا نہ آئے مگر شرط یہ ہے کہ طالب علموں کو انگریزی زبان میں پڑھایا جائے۔جبکہ دنیا بھر کے ماہرین تعلیم کا یہ ماننا ہے کہ معیاری تعلیم مادری زبان ہی میں دی جاسکتی ہے۔دنیا میں دو زبانیں ایسی ہیں جو ہر شخص بغیر کوئی علم حاصل کیے بول یا سمجھ سکتا ہے۔ایک مادری زبان اور دوسری اشاروں کی زبان۔اشاروں کی زبان کو عالمی زبان کہا جاتا ہے۔یہ دنیا کی وہ واحد زبان ہے،جس کو سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور مادری زبان وہ ہے جو انسان شعور سنبھالنے کے بعد اپنے والدین،گھر اور ماحول سے سیکھتا ہے۔

مادری زبان صرف زبان نہیں ہوتی، بلکہ پوری ایک شناخت ہوتی ہے۔ ایک پوری تہذیب، تمدن، ثقافت، جذبات و احساسات کا حسین امتزاج ہوتی ہے۔ مادری زبان میں خیالات و معلومات کی ترسیل اور ابلاغ ایک قدرتی اور آسان طریقہ ہے۔سوچنے اور سمجھنے کا عمل جو

سراسر انسانی ذہن میں تشکیل پاتا ہے، وہ بھی لاشعوری طور پر مادری زبان ہی میں وجود میں آتا ہے۔ انسان خواب بھی مادری زبان ہی میں دیکھتا ہے۔ انسانی ذہن اور تخلیقی عمل میں رابطے کا کام بھی غیر ارادی طور پر مادری زبان میں ہی انجام پاتا ہے۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا سب سے بہترین اظہار بھی مادری زبان ہی میں ممکن ہے۔ اپنے خیالات کے فوری اظہار کے لیے بھی مادری زبان ہی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ فہم انسانی کا براہِ راست تعلق بھی ذہن انسانی اور مادری زبان کے رابطے ہی سے ہوتا ہے۔ گویا سیکھنے اور سکھانے کے لیے آسان ترین زبان، مادری زبان ہی ہے، اِس کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ تخلیق اور ایجاد کا براہِ راست تعلق بھی مادری زبان سے ہے۔ سائنسی اور فنّی علوم میں نفس مضمون، سائنسی نظریات کی فہم اور ترسیل وابلاغ کے لیے بہترین ذریعہ مادری زبان ہی مانا جاتا ہے۔ مادری زبان میں قدرتی طور پر یہ وسعت اور گنجائش ہوتی ہے کہ وہ تمام تر جدید عصری علوم بشمول سائنسی علوم کو ان کی اصل اصطلاحات کے ساتھ بغیر کسی ترجمے کے اپنا سکتی ہے اور ان کی ترسیل وابلاغ کر سکتی ہے۔ مادری زبان انسانی شناخت، تشخص اور کردار سازی میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ہر وہ زبان جس میں لٹریچر تخلیق پا سکتا ہو، ترسیل علم کے لیے بہترین مانی جاتی ہے۔ جب کہ لٹریچر کا تعلّق بھی مادری زبان سے ہی ہوتا ہے۔

لہٰذا ماہرینِ تعلیم کی رائے میں ذریعہ تعلیم کے لیے مادری زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقّی یافتہ دنیا میں زیادہ تر ممالک میں تعلیم مادری زبانوں میں دی جاتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو (یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن) کا یہ کہنا ہے کہ یہ ادارہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ اس طریقے سے معیار تعلیم میں اضافہ ہوتا ہے، نیز استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جو بچے ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرتے ہیں وہ اجنبی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے مقابلے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یونیسکو اور دیگر ادارے اس حقیقت پر زور دیتے رہے ہیں کہ مادری زبان میں حصولِ علم خوداعتمادی اور خودشناسی کے ساتھ ساتھ بچے کی مجموعی نشوونما کے لیے بھی ناگزیر ہے۔

سائنسی علوم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ہمیں سائنس اپنی مادری زبان میں پڑھانی چاہیے، بصورت دیگر سائنس کا علم صرف طبقہ امراء تک محدود ہوکر رہ جائے گا اور عوام الناس سے اس کا

رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اگر چہ ہمارے نظام تعلیم نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ وہ انجینئرنگ، طب، قانون اور لسانیات میں بین الاقوامی شہرت یافتہ کورسز پیش کرتا ہے، لیکن ہم نے خلافِ عقل اپنے ہی لوگوں کو وہاں تک رسائی سے محروم کر دیا ہے۔ پاکستان میں بھی ہم نے اتنے برسوں میں صرف انگریزی میڈیم یونیورسٹیوں اور کالجوں کا ایک چھوٹا نیٹ ورک بنا دیا اور ہماری اپنی زبانیں پیشہ ورانہ تعلیم سے محروم رہیں۔ اس طرح ہم نے اپنے ملک کے پس ماندہ علاقے کے طالب علموں کی اکثریت کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی ہے اور ہم اس کے خود ذمہ دار ہیں۔ دنیا کے جو ممالک ترقی یافتہ کہلاتے ہیں وہاں تعلیم و تدریس ان کی اپنی مادری اور قومی زبان میں ہوتی ہے جیسے کہ جاپان کی یونیورسٹیوں کے بیش تر تعلیمی پروگراموں کی تدریس جاپانی زبان میں ہوتی ہے۔ یہی صورت حال چین کی بھی ہے جہاں نیچے سے یونیورسٹی سطح تک ذریعہ تعلیم وہاں کی قومی زبان ہے۔ یورپ میں بھی یہی صورت حال ہے۔ فرانس اور جرمنی میں اپنی زبانوں کے تحفظ کا رجحان شدت سے موجود ہے۔ فرانس تو اس حد تک جا پہنچا ہے کہ ''ذریعہ تدریس صرف فرانسیسی'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، جبکہ جرمنی میں اسکولوں میں تعلیم کی زبان بنیادی طور پر صرف جرمن ہے اور ماسٹر پروگرام بھی 50 فی صد جرمن زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ کینیڈا میں لسانی تنوع کی بہت عمدہ تصویر سامنے آتی ہے، اگر چہ زیادہ تر صوبوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے، مگر کیوبک میں فرانسیسی بولنے والوں کا غلبہ ہے اور یہاں کے بیش تر اسکولوں میں بلکہ متعدد یونیورسٹیوں میں بھی ذریعہ تعلیم فرانسیسی ہے۔

اس عالمی تناظر کی روشنی میں اگر ہم اپنے ملک کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو بہت ہی افسوسناک صورت حال کا سامنا ہے۔ ہمارے یہاں نہ صرف زیادہ تر پیشہ ورانہ کورسز انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں اور انجینئرنگ، طب اور قانون میں تو صورت حال مزید ناگفتہ بہ ہے، بلکہ ابتدا سے ہی بچوں کو مادری زبان کے بجائے انگریزی میں تعلیم دیتے ہیں اور انہیں اپنی زبان سے ناواقف رکھنے کی گویا شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انہیں نہ انگریزی آتی ہے اور نہ ہی اردو سے وہ مانوس ہو پاتے ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں نے کئی نوجوانوں سے تشفی کا مطلب پوچھا تو انہیں اس کا مطلب نہیں معلوم تھا۔ ایسے ہی اردو کے کتنے ہی الفاظ اب اجنبی ہوتے جا رہے ہیں یہ تہذیبی خودکشی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

تعلیم و تربیت

بنت کرم

ہوم سکولنگ

مائیں بچوں کو گھر پہ خود پڑھائیں اور پانچ سال کی عمر سے پہلے انہیں ہرگز سکول داخل نہ کرائیں

ہمارے دور میں پانچ سال کا بچہ سکول داخل کروایا جاتا تھا اور یہی اس کی سیکھنے کی سب سے بہترین عمر ہوتی تھی۔ چار یا ساڑھے تین سال کے بچے کو سکول میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ پھر زمانہ پلٹا، ہر محلے اور گلی میں پرائیویٹ سکول کھلنا شروع ہو گئے جہاں تعلیم کے ابتدائی مدارج کو پلے گروپ، پری نرسری، کے جی یا پریپ کا نام دے دیا گیا۔ اب گھر بیٹھی ماؤں کو تین سال کی عمر میں بچوں سے جان چھڑانے کا موقع مل گیا۔ جیسے ہی بچہ بولنا شروع کرتا ہے ان کو لگتا ہے سکول داخل کرانے کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ نجی سکولوں کو اور کیا چاہیے تھا، وہ اڑھائی سال کا بچہ داخل کرنے پر بھی تیار ہو گئے اور دھڑا دھڑ ایڈمیشن ہونے لگے۔ [ادھر کتب فروش پبلشروں نے اسے کمائی کا ذریعہ جانا اور دھڑا دھڑ کئی کئی کتابیں پری سکول کی ہر سطح کی چھاپ دیں اور سکولوں نے بھی اس لوٹ مار میں پیچھے رہنا عار سمجھا اور پلے گروپ، نرسری، پریپ I، پریپ II، کے لیے الگ الگ نصابی کتب ان معصوموں کے کندھوں پر لاد دیں]۔

وہ بچہ جسے ماں کی نرم آغوش چاہیے تھی، کھیلنے اور جی بھر کے سونے کی عمر میں سکول یونیفارم پہن کر پلاسٹک اور لکڑی کی کرسیوں پر نیند سے جھولتا رہتا ہے۔ جس بچے نے ابھی پیشاب پر کنٹرول کرنا نہیں سیکھا وہ صبح سات سے دو بجے تک ایک ایسی بھیڑ میں بھیج دیا گیا جہاں آنے کا مقصد اسے خود نہیں معلوم تھا۔

گیٹ پر چیختے چلاتے اور بلکتے بچے گارڈ کے حوالے کر کے ماں باپ فخر سے گھر کو چل دیتے ہیں۔ پچھلے پانچ سال کے سروے کے مطابق نجی سکولوں میں سوا دو لاکھ ایسے بچے داخل ہوئے جن کی عمریں بمشکل تین برس ہیں جو رکشوں، ویگنوں، موٹر سائیکلوں پر دھکے کھاتے سکول پہنچتے ہیں اور سارا دن روتے دھوتے اور اونگھتے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔

2015ء میں ایک معروف ادارے میں مجھے پری جونیئر سیکشن کا ہیڈ بنایا گیا۔ جو بچے

دوسرے سکول سے پلے گروپ اور نرسری پاس کر کے آتے وہ ہنوز صفر تھے۔ دو سال خوار ہونے کے باوجود نصف بچوں کو الفاظ کی شناخت یا حروف کو جوڑنا نہیں آتا تھا۔ ان بچوں میں علم کا شوق بھی کم تھا، ان کی طبیعت میں سکول سے بیزاری بھی عیاں ہوتی تھی۔ ان کے چہرے تھکے ہوئے اور آنکھوں کے نیچے حلقے ہوتے تھے۔ یہ ایک آدھ بچے کی بات نہیں، میں پوری پوری کلاس کا مشاہدہ کرتی تھی اور ہر بچے کو سامنے بٹھا کر انٹرویو کرتی تھی۔

اس کے برعکس ہر وہ بچہ جو پانچ سال کی عمر میں سکول داخل ہوا تھا اس کے اندر سکول سے واضح محبت، سیکھنے کے عمل میں تیزی اور صحت زیادہ بہتر تھی۔ اس کا قد کاٹھ اور اعتماد ان بچوں سے بہتر تھا جو تین سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کرنے پہنچے تھے۔

بات یہ نہیں کہ نجی سکول محنت نہیں کرتے۔ اصل میں بچہ اتنا کم عمر ہوتا ہے کہ اس میں اتنا کچھ جذب کرنے اور چھ گھنٹے بیٹھنے کی سکت وصلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ نتیجہ صفر نکلتا ہے۔

اگرچہ ٹیچر ہونے کی وجہ سے میرے بچوں کی سکول فیس نصف تھی لیکن میرے دونوں بچوں نے پانچ سال کی عمر میں داخلہ لیا اور وہ بنیادی سلیبس گھر میں ہی پڑھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج اپنی اپنی جماعتوں میں نمایاں پوزیشنز پر ہیں۔

اگر کوئی مجبوری نہیں ہے تو پانچ سال سے پہلے بچوں کو ہرگز سکول داخل مت کرائیں، بنیادی حروف کی پہچان اور ریڈنگ گھر میں کرائیں، پیار سے گود میں بٹھا کر ان کو پینسل پکڑنے کا طریقہ سکھائیں۔ نجی سکول سال بھر میں ان کو اتنا نہیں سکھا پاتے جتنا ماں ایک مہینے میں سکھا سکتی ہے۔

بطور استاد اگر میں ماؤں کو مشورہ دوں تو خدا کے لیے ہوم سکولنگ کی طرف آئیں نہ صرف اضافی خرچے کی بچت ہوگی بلکہ مستقبل میں ایک صحت مند اور ذہین ترین بچہ آپ کی نسل میں پروان چڑھے گا۔

یہ شمعیں چھوٹی چھوٹی سی
کل ممکن ہے خورشید بنیں

میڈیا عامر خاکوانی

فلم جوائے لینڈ پر پابندی لگنی چاہیے

ہم حیران ہیں کہ اس فلم کے خلاف دینی حلقوں کی طرف سے اتنی آواز نہیں اٹھی جتنی اٹھنی چاہیے تھی

جوائے لینڈ ایک پاکستانی ڈائریکٹر صائم صادق کی بنائی ہوئی پنجابی فلم ہے۔ انہی صاحب نے اس کی کہانی بھی لکھی ہے اور اس کی ایڈیٹنگ میں بھی شامل رہے ہیں۔ بیشتر فنکار پاکستانی ہیں۔ مرکزی کردار علی جونیجو نے ادا کیا دوسرا مرکزی کردار الینہ خان نامی ایک ٹرانس جینڈر نے ادا کیا ہے، جبکہ ٹی وی کی معروف اداکارہ ثانیہ سعید اور ثروت گیلانی کے بھی اہم کردار ہیں، راستی فاروق نے بھی اہم کام کیا۔ اس کے پروڈیوسروں کی اچھی خاصی طویل فہرست ہے۔ نو دس لوگ ہیں۔ سرمد کھوسٹ، اپوروا گرو چارن (یہ لاس اینجلس میں مقیم انڈین نژاد امریکی پروڈیوسر ہیں)، ثنا جعفری، اولیور رج، لارین مان، کیتھیرین برنسٹ، رمن بہرانی وغیرہ۔ عام طور پر کسی فلم کے پروڈیوسر اتنے لوگ نہیں ہوتے، سرمد کھوسٹ تو خیر پاکستانی اداکار اور ہدایت کار ہیں، منٹو فلم انہوں نے بنائی تھی، دیگر پروڈیوسرز میں سے بعض عالمی سطح پر اچھے خاصے معروف ہیں۔ حیران کن طور پر یہ سب معروف لوگ اس چھوٹی سی پاکستانی پنجابی فلم کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں، جس کی زبان بھی وہ نہیں سمجھ سکتے۔ لگتا ہے ان سب نے ''نیکی'' کا کام سمجھ کر اس فلم میں حصہ ڈالا۔ خبروں کے مطابق ملالہ یوسف زئی نے بھی اس فلم کے حوالے سے اپنا کردار ادا کیا۔ وہ ایگزیکٹو پروڈیوسر کی ذمہ داری نبھا رہی ہیں۔

یہ فلم پاکستان میں نومبر کے دوسرے عشرے میں سینما ہاؤسز میں لگانی تھی۔ فلم کے خلاف احتجاج کی ایک لہر سوشل میڈیا پر اٹھی، تنقید ہوئی تو مرکزی سنسر بورڈ نے خلاف رائے دی اور حکومت نے پابندی لگا دی۔ پھر خبر آئی کہ وزیراعظم شہباز شریف نے اس کا جائزہ لینے کے لئے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی بنا دی ہے۔ جب حکومت پابندی لگا چکی تھی تو پھر اس پر نظر ثانی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بظاہر یہ لگ رہا ہے کہ مختلف این جی اوز کے دباؤ اور لبرل عناصر کی کمپین کے نتیجے

میں اس فلم کو نمائش کی اجازت دینے کا راستہ نکالا جا رہا ہے (تازہ خبر یہ ہے کہ کمیٹی نے یہ فلم ریلیز کرنے کی اجازت دے دی ہے)۔

یہ فلم بنیادی طور پر ایک ایل جی بی ٹی پلس (LGBT+) فلم ہے۔ جو لوگ اس اصطلاح کو نہیں جانتے، وہ سمجھ لیں کہ اس سے مراد لیز بین، گے، بائی سیکوشیل، ٹرانس جینڈر رہے، اب اس ترکیب میں اضافہ ہو چکا ہے، Q سے مراد کوئیر (Queer) ہے۔ آسان لفظوں میں کوئیر سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی جسمانی روپ سے مطمئن نہیں۔ قدرت نے انہیں مرد بنایا مگر خود کو عورت سمجھتے ہیں، اسی طرح کہیں پر عورت ہے مگر وہ خود کو مرد سمجھتی اور جسمانی طور پر بھی ویسا بننا چاہتی ہے۔ فلم کی جھلک، موضوع اور فنکاروں کے انٹرویوز سے صاف ظاہر ہے کہ زیادہ فوکس ایک ٹرانس جینڈر کی لو لائف اور سیکشوئل لائف پر ہی ہے۔ فلم میں ایک روایتی گھرانا دکھایا گیا ہے، جس کا سربراہ ایک معذور مگر سخت گیر رجعت پسند والد رانا امان اللہ ہے۔ عثمان پیرزادہ کے بھائی سلمان پیرزادہ نے یہ کردار ادا کیا۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کے بیٹے جلد اسے پوتے کا تحفہ دیں۔ رانا امان کا چھوٹا بیٹا حیدر (اداکار علی جونیجو) شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک ٹرانس جینڈر (خواجہ سرا ڈانسر) پر عاشق ہو جاتا ہے۔ یوں فلم اس ٹرانس جینڈر (الینہ خان) کے مسائل، اس کی لو لائف اور ہیرو کے ساتھ اس کے (فزیکل) رومانس کے گرد گھومتی ہے۔ کہانی میں دیگر خواجہ سراؤں کے کردار، ان کی آپس کی لڑائیاں، چشمک وغیرہ بھی دکھائی گئی ہے۔ کانز فلم فیسٹول میں اسے کوئیر پام ایوارڈ ملا ہے۔ یہ ایوارڈ ہم جنس پرستی/مخنث/ٹرانس جینڈر موضوعات پر فلموں کو دیا جاتا ہے۔ اس ایوارڈ کا دیا جانا بذات خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ ایل جی بی ٹی فلم ہے اور یہ مین سٹریم موضوع کی فلم نہیں۔

میرے خیال میں فلم جوائے لینڈ کی پاکستانی سینما ہاؤسز میں نمائش پر پابندی لگنی چاہیے۔ یہ فلم اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ کی بنا پر ایسی نہیں کہ اسے سینماؤں میں لگایا جائے۔ اس کی دو تین وجوہات ہیں۔ یہ فلم اور اس کا موضوع پاکستانی سماج کے بنیادی فیبرک کے خلاف ہے۔ ہمارا سماج ایک مشرقی اسلامی (Eastern Islamic) مزاج رکھتا ہے۔ اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ یہاں بعض چیزیں معروف ہیں، عرب جسے عرف کہتے ہیں۔ اسلام، مشرقی تہذیب، شرم وحیا، تحفظ فروج (عصمت کی حفاظت) ہماری تہذیب کے بنیادی اجزا ہیں۔ حیا ویسے بھی حدیث مبارکہ

کے مطابق اسلامی تہذیب کا جوہر ہے۔ ہمارے ہاں ہم جنس پرستی سخت غیر اخلاقی بات سمجھی جاتی ہے اور قانونی طور پر جرم ہے۔ مغربی تہذیب اور اب بھارتی تہذیب میں ہم جنس پرستی، اپنی مرضی سے جسمانی تعلق قائم رکھنا، ماورائے شادی جسمانی تعلق، کسی قانونی بندھن کے بغیر اکٹھے رہنا (Live in Relation) عام بات ہے۔ وہاں قانون سازی کے بعد یہ سب فطری اور نارمل چیزیں بنا دی گئی ہیں۔ بھارت میں چند سال پہلے تک ہم جنس پرستی پر سزا تھی، اب وہاں قانون بدل گیا ہے، کوئی پابندی نہیں رہی۔ پاکستان میں ایسا نہیں۔ ہمارا مذہب اس حوالے سے بہت واضح اور غیر مبہم ہے، یہ سب غیر فطری اور گناہ کبیرہ کے درجے میں ہیں۔ ہمارے سماج میں اس کے لئے سخت مزاحمت موجود ہے۔

ایسا نہیں کہ ہمارا معاشرہ فرشتوں کا ہے، بہرحال یہاں انسان رہتے ہیں۔ گناہ بھی ہوتے ہیں، قوانین کی خلاف ورزی بھی، مگر یہ حدود وقیود برقرار ہیں اور انہیں رہنا چاہیے۔ اگر ختم ہوئیں تو یہ برائیاں کئی گنا بڑھ جائیں گی۔ سماج میں یہ رکاوٹ یا بیریئر کا کام دے رہی ہیں۔ ہمارے ہاں غیر فطری تعلق قائم ہونے کے بعض واقعات ہوتے ہیں، مگر ان کی نوعیت مختلف ہے، یہ مغرب کے ''گے کلچر'' جیسی ہرگز نہیں۔ سماج مجموعی طور پر اسے غلط سمجھتا ہے۔ پاکستان ایک بڑی آبادی والا ملک ہے۔ اتنے بڑے ملک میں ٹرانس جینڈر، خواجہ سرا وغیرہ بمشکل چند ہزار ہوں گے، یہ ایک فی صد بھی نہیں بنتا۔ اس لئے ٹرانس جینڈر رائٹس اور ایشوز وغیرہ محض این جی اوز کا ایجنڈا اور فارن فنڈنگ جسٹی فائی کرنے کا ایک طریقہ ہی ہے۔ لوگوں کے بڑے مسائل دوسرے ہیں، مگر چونکہ ان کے لئے فارن فنڈنگ میسر نہیں، اس لئے ہماری انٹرٹینمنٹ انڈسٹری کے ذہین دماغ ادھر آنے کی زحمت نہیں کرتے۔ جیسے یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ کئی ملین بلکہ کروڑوں میں بچے ناکافی غذا ملنے کے باعث دماغی طور پر کمزور اور سلو ہو چکے ہیں۔ اتنے بڑے ایشو پر کبھی کوئی ڈرامہ یا فلم نہیں دیکھیں گے، حالانکہ اس پر آگہی بڑھانے سے کروڑوں لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔

ہمارے ہاں خواجہ سراؤں کے لئے جینوئن ہمدردی پیدا ہو چکی ہے۔ الخدمت، اخوت، غزالی ٹرسٹ سکول جیسی معروف سماجی تنظیمیں جن کی قیادت مذہبی لوگ ہی کر رہے ہیں، وہ خواجہ سراؤں کے لیے کئی پراجیکٹ شروع کر چکے ہیں۔ ان کے لیے قانون سازی ہوئی ہے۔ افسوس کہ مغربی سٹائل کی ٹرانس جینڈر موومنٹ والے اپنے الٹرا لبرل ایجنڈے کے باعث حقیقی خواجہ

سرا کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ جوائے لینڈ جیسی فلم نام نہاد ٹرانس جینڈرز کی سوچ کی نمائندہ ہے جو اپنی جنسی خواہشات سے مغلوب ہو کر سب کچھ تلپٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی جوائے لینڈ ایک آف بیٹ (Off Beat) فلم ہے، اس کا موضوع اور ٹریٹمنٹ مین سٹریم نہیں اور نہ ہی یہ عام فلم بینوں کے لئے ہے۔ قوی امکانات ہیں کہ سینما ہاؤسز میں اس کی نمائش شدید عوامی ردعمل کا باعث بنے گی۔ ایسی کلٹ فلمیں محدود حلقے کے لئے ہوتی ہیں، دلچسپی رکھنے والے اسے او ٹی ٹی فورم پر یا یوٹیوب وغیرہ کے ذریعے دیکھ لیں گے۔ انہیں سینما ہاؤس میں لگانے کی اجازت دینا LGBT کے پورے تصور اور ''کوئیر'' موضوعات کی حوصلہ افزائی کرنے کے مترادف ہے۔ جوائے لینڈ جیسی فلمیں دراصل سماج میں موجود بیریئر توڑنے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ سینما میں نمائش اس موضوع کو نارمل اور عام بنانے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔

فلم دیکھنے والے جانتے ہیں کہ اسی انداز میں برسوں پہلے بھارت میں ایک فلم فائر بنائی گئی، شبانہ اعظمی نے اس میں کام کیا۔ پھر مشہور پروڈیوسر کرن جوہر نے جو خود مبینہ طور پر ''گے'' ہے، اس نے ان موضوعات پر کئی فلمیں بنائیں، ٹی وی ڈرامے بھی۔ بھارتی سماج میں بیریئر ٹوٹتے گئے، حتیٰ کہ آج وہاں یہ سب نارمل، عام اور قانونی طور پر جائز ہو چکا ہے۔ ہر وہ شخص جو پاکستان میں LGBT اور ٹرانس جینڈرز کے بڑھتے رجحان کے آگے بند باندھنا چاہتا ہے۔ وہ سماج میں موجود بیریئرز برقرار رکھنے کا خواہش مند ہے، اسے جوائے لینڈ کی نمائش کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ وزیر اعظم شہباز شریف کو عوامی جذبات اور عوامی ردعمل کا اندازہ لگا کر پابندی برقرار رکھنی چاہیے۔ مسلم لیگ ن میں موجود لبرل کیمپ پچھلے چند برسوں میں زیادہ طاقتور ہوا ہے، ن لیگ کو مگر ووٹ عوام سے لینے ہیں، ان لبرلز سے نہیں۔ اپنی سیاست کو اپنے ہاتھوں دفن نہ کریں۔ تحریک انصاف کو بھی عوامی جذبات کی نمائندگی کرتے ہوئے اس پر آواز اٹھانی چاہیے۔ عمران خان جس ریاست مدینہ کی بات کرتے ہیں، اس میں جوائے لینڈ جیسی ایل جی بی ٹی /کوئیر فلموں کی کوئی گنجائش نہیں۔ جماعت اسلامی کے سینیٹر مشتاق خان نے پہلے بھی بھرپور طریقے سے آواز اٹھائی، انہیں پھر متحرک ہونا پڑے گا۔ ویسے یہ کسی ایک جماعت کا نہیں، ہم عوام کا مشترکہ مسئلہ ہے، اس کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

تزکیۂ نفس

سید خالد جامعی

'خیر القرون'۔ایک مثالی اسلامی معاشرہ

یہ ہماری اور ہمارے دینی حلقوں کی نالائقی اور بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے معاشرے کو 'خیر القرون' جیسا معاشرہ بنانے کو تیار ہیں اور نہ اس کے لیے کوشاں ہیں

اعلیٰ معیارِ زندگی عصر حاضر کا خدا ہے جو سرمایہ سے حاصل ہوتا ہے۔امت اسی میں مبتلا ہے اور یہ بھول گئی ہے کہ انقلاب امامت کے لیے بھوکا رہنا پڑتا ہے اپنا معیار زندگی کم کرنا پڑتا ہے اور مسلسل کم کرنے پر راضی رہنا ہوتا ہے۔بھوکا رہنا، خالی پیٹ ہونا کوئی عیب نہیں یہ اللہ کے مقربین کی صفت ہے۔کم کھانے ،کم سونے ،کم بولنے، دنیا سے کم سے کم تمتع کرنے کے باعث اہل اللہ پر اسرار کھلتے اور ان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔کھاتے رہنے سے بھوک نہیں مٹتی ، بھوک کم کھانے اور کھانا ترک کرنے سے مٹتی ہے۔مستقل کھاتے رہنے والا ہمیشہ بھوکا ہی رہتا ہے۔جو بھوک کو قبول کرے اس کی بھوک مٹ جاتی ہے، نفس قانع ہو جاتا ہے اسی لیے صحابہ وصلحائے امت کثرت سے روزے رکھتے تھے۔انبیاء کی تہذیبوں میں روزے رکھنا عام بات ہے۔لوگ لذّات دنیا سے کنارہ کش رہتے ہیں تب ہی ان پر حکمت کے چشمے القاء ہوتے ہیں۔لذت و چٹخارے میں مبتلا قوم کے معدے ہمیشہ کچھ نہ کچھ طلب کرتے رہتے ہیں۔حضرت موسیٰؑ کی قوم اس کی مثال ہے جسے حالت جہاد میں بھی مَن وسلویٰ پسند نہ تھا، اسے قسم قسم کے کھانے درکار تھے۔

جب جمعہ کے خطبے میں ہم یہ سنتے ہیں کہ "خیر القرون قرنی"تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ دور جب آخرت ہر رویے پر غالب تھی جب دنیا سب سے حقیر شے تھی، جب اللہ کی رضا اور معرفت ہی حاصلِ زندگی تھی۔دنیا سے تمتع کم سے کم تھا۔کوئی ترقی ، دنیا طلبی ،لذات وآسائش کی تلاش میں سرگرداں نہیں تھا۔فقر کی خود اختیاری زندگی پر سب کو فخر تھا۔وہ کفار کی طرح دنیا سے تمتع کو درست نہیں سمجھتے تھے اور عیش وعشرت کی زندگی کے طالب اور حریص نہ تھے۔وہ صرف اور صرف حریصِ آخرت تھے اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی تگ و دو میں مصروف رہتے تھے۔اگر خیر القرون ہی اصل معیار ہے تو ہمارا موجودہ طرز زندگی اس کی نفی ہے۔جدیدیت [ماڈرن ازم] اور خیر القرون کی جستجو ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔دنیا اور دین برابر نہیں ہو سکتے۔جو آخرت کو ترجیح دے گا وہ دنیا کا نقصان کرے گا اور جو دنیا کو ترجیح دے گا وہ لازماً

آخرت کا نقصان کرے گا۔ یہ ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

صحابہ کرامؓ کی محبت کا مرکز ومحور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ ان کا جینا اور مرنا، کھانا اور پینا صرف اور صرف اسلام کے لیے تھا۔ اپنی ذات کو وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے فنا کر چکے تھے۔ ان کا حال ام المومنین حضرت جویریہؓ کے الفاظ میں یہ تھا: "اختر ت اللہ و رسولہ" میں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو چن لیا ہے، اختیار کر لیا ہے۔[1]

یہ الفاظ آپ نے اپنے والد اور قبیلۂ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار سے اس وقت کہے جب وہ آپ کو رہا کرانے کے لیے بہت سا مال و دولت بطور فدیہ لے کر آئے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت جویریہ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: جویریہ موجود ہیں جانا چاہیں تو لے جاؤ۔ باپ نے کہا کہ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمھیں میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی ہے۔ ساتھ چلو مگر جواب انکار میں ملا۔ باپ نے اپنی عزت کا واسطہ دیا لیکن حضرت جویریہؓ نے خود کو دین اسلام کی محبت میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس گرفتاری سے رہائی پر تیار نہ ہوئیں اور آپ کے ایمان و استقامت کے باعث نہ صرف آپ کے والد اور بھائی بلکہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت جویریہؓ کی سوکن ام المومنین حضرت عائشہؓ کا اعتراف محبت دیکھیے فرمایا:

فَمَا اَعْلَمُ امْرَأَةً كَانَتْ اَعْظَمَ بَرَكَةً عَلٰی قَوْمِهَا مِنْهَا۔[2] ''میرے علم میں کوئی عورت ایسی نہیں ہے جو جویریہ سے زیادہ اپنی قوم کے لیے باعث خیر و برکت ہو۔''

سوکن کا یہ اعتراف ایمان اور اسلام کی خیر و برکت کا نتیجہ ہے اور قرن اول کی روحانیت کا ثمر ہے۔ اسی روحانیت کا اثر یہ تھا کہ ام المومنین حضرت حبیبہؓ کے والد حضرت ابوسفیانؓ صلح حدیبیہ کے بعد اہل مکہ کے نمائندے بن کر صلح سے متعلق بعض معاملات کے بارے میں گفتگو کے لیے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور اپنی بیٹی ام حبیبہؓ کے گھر کاشانۂ رسالت میں ان سے ملنے گئے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر جو بچھا ہوا تھا لپیٹ دیا۔ حضرت ابو سفیانؓ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا، آیا یہ بستر میرے لائق نہیں ہے یا میں بستر کے لائق نہیں ہوں؟ آپ نے فرمایا: ابا جان آپ مشرک ہیں اور یہ رسول اللہ کا بستر ہے اس لیے آپ اس بستر

---

[1] زرقانی ج ۲، ص ۲۵۵

[2] مسند احمد: ۲۶۸۹۷

پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہیں۔ [۱]

جامع ترمذی باب ماجاء فی عدة المتوفی عنها زوجها میں حضرت زینبؓ سے روایت ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ کے والد حضرت ابوسفیانؓ کی وفات پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں [آپ کی وفات کو تین دن گزر چکے تھے]۔ حضرت ام حبیبہؓ نے ایک خوشبو (جو زعفران وغیرہ سے بنائی جاتی ہے اور جس میں سرخ و پیلا رنگ ہوتا ہے) منگوائی اور ایک بچی کے لگائی، پھر اپنے رخساروں پر بھی لگائی اور فرمایا مجھے خوشبو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے رسالت مآب ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: کسی صاحب ایمان عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی میت کا تین دن سے زیادہ سوگ منائے، البتہ شوہر پر چار مہینہ دس دن سوگ منائے گی۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لیے اپنے رخساروں پر خوشبو لگائی ہے۔

کیا عصر حاضر میں یہ رویہ کسی دینی گھرانے میں اختیار کرنا ممکن ہے؟ کتنی بدعات رسوم ورواج کے نام پر اختیار کر لی گئی ہیں۔ ظہر، مغرب، عشاء اور فجر کی بارہ سنت موکدہ نمازوں کے بارے میں رسالت مآب ﷺ کی تاکید سننے کے بعد حضرت ام حبیبہؓ کا ارشاد تھا "فما برحت اصليهن بعد"۔ [۲] یعنی میں نے جب سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے کبھی ان رکعتوں کا ناغہ نہیں کیا۔

ام المومنین حضرت صفیہؓ کے باپ حيي ابن اخطب قبیلہ بنی نضیر کے سردار تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارونؑ تک پہنچتا تھا۔ حضرت صفیہ کی والدہ قبیلہ بنی قریظہ کے سردار کی بیٹی تھیں۔ [۳] غزوۂ خیبر کے بعد حضرت صفیہؓ حضرت دحیہ کلبیؓ کو رسالت مآب ﷺ نے عطا کیں۔ بعد میں بعض اصحاب کے مشورے پر انہیں آزاد کر دیا کہ وہ اپنے وطن چلی جائیں یا مسلمان ہو کر آپ سے نکاح کر لیں۔ حضرت صفیہؓ نے فرمایا: "اخترت الله و رسوله لقد كنت اتمنى ذلك في الشرك" میں تو اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ الحمد للہ کہ اس نے ایمان کی دولت سے نواز دیا۔ میری تو اسلام لانے سے پہلے بھی یہی خواہش تھی۔ [۴]

---

[۱] البدایہ والنھایہ، ج ۴، ص ۱۴۳
[۲] مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۶۷۷۵
[۳] زرقانی، ج ۳، ص ۲۵۶، اسیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۲۳۱
[۴] زرقانی، ج ۳، ص ۲۵۸

اللہ کے لیے اللہ کے رسول کو اختیار کرنا یہی مطلوب ایمان ہے۔ عرب کے دو بڑے قبیلوں سے وابستہ ان خاتون کا نکاح خیبر سے واپسی پر راستے میں منعقد کیا گیا۔ دوسرے دن ولیمہ ہوا۔ صحابہ کرامؓ اپنے اپنے سامان میں سے کھجور پنیر گھی وغیرہ لے آئے جو ایک دستر خوان پر رکھ کر کھالیا گیا۔ یہی ولیمہ ہو گیا۔ (۱)

کیا جمعہ کے خطبے میں "خیر القرن قرونی" کی حدیث سننے والے دنیا میں آباد دو ارب مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی عصر حاضر میں ولیمے کے لیے اس طرح کی دعوت کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ اگر کسی سے کہہ بھی دیا جائے تو وہ ایسی دعوت کو اپنے پیغمبر کی اتباع میں بھی قبول نہیں کرے گا کیونکہ یہ سادگی عہد حاضر کے غالب پُرتعیش تعقل سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ کے بارے میں ان کی باندی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ وہ یہود کی طرح اب تک یوم السبت کی تعظیم کرتی اور یہود کے ساتھ صلۂ رحمی کرتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حقیقت معلوم کرنا چاہی تو فرمایا کہ جب سے اللہ نے یوم الجمعہ عطا فرمایا ہے میں یوم السبت کی تعظیم نہیں کرتی۔ یہودیوں سے میری قرابت داری ہے ان کے ساتھ صلۂ رحمی کرتی ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی باندی سے پوچھا کہ کہ تم نے یہ شکایت کیوں کی؟ باندی نے کہا کہ مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا۔ آپ نے باندی کو سزا نہیں دی بلکہ فرمایا اچھا جاؤ تم آزاد ہو۔ (۲) عفو و درگزر، کرم، محبت، انتقام سے گریز، عطا، سخاوت کا یہ رویہ خیر القرون میں عام تھا اب مفقود ہے۔

ام المومنین حضرت میمونہؓ کثرت سے نماز پڑھتی تھیں، غلام آزاد کرنے کا بھی بہت شوق تھا ان کے خوفِ خدا اور صلۂ رحمی کے اعتراف میں آپ کی سوکن حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

"اما انها كانت من اتقانا الله و اوصلنا للرحيم" میمونہ ہم لوگوں میں خوف خدا اور صلہ رحمی میں ممتاز مقام رکھتی تھیں۔ (۳)

اتباع رسالت کا عالم یہ تھا کہ آپ حج یا عمرہ کے لیے مکہ آئیں تھیں۔ طبیعت خراب ہوئی تو اپنے بھانجے سے کہا کہ مجھے مکہ سے لے چلو کیونکہ مکہ میں میرا انتقال نہیں ہوگا۔ رسول اللہ نے مجھے

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۲۳۲، صحیح بخاری جلد ۲، ص ۶۰۶، باب غزوۂ خیبر
(۲) اصابہ، ج ۷، ص ۱۴۷
(۳) اصابہ و زرقانی بحوالہ طبقات ابن سعد

پہلے ہی اطلاع دے دی ہے کہ تم کو مکہ میں موت نہیں آئے گی اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطلاع کے مطابق آپ کا انتقال مدینہ کے قریب مقام سرف میں ۵۱ھ میں ہوا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ کا نکاح اور ولیمہ ۷ھ میں ہوا تھا۔

عہد رسالت میں جہیز کا کوئی تصور نہ تھا لہٰذا حدیث کی کسی کتاب میں جہیز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ حضرت علیؓ نے مہر میں اپنی زرہ یا اس کی قیمت دی تھی کہ ان کے پاس مہر ادا کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو ایک چادر، ایک مشکیزہ، چمڑے کا ایک گدا جس میں اذخر نام کی گھاس بھری ہوئی تھی اور چند چیزیں دیں۔ کیا عہد حاضر میں کسی دین دار گھرانے میں اس سادگی سے نکاح ممکن ہے؟ ایسے نکاح کو نہایت ذلت وحقارت سے دیکھا جائے گا اور کنجوس، لیئم کے طعنے دیئے جائیں گے۔ اس رویے کے ساتھ مسلمان پوچھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ اسلامی انقلاب کب آئے گا اور استخلاف فی الارض کب عطا ہوگا؟

حضرت حسنؓ کے بارے میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا "ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین الفئتین عظیمتین من المسلمین"[1] میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اللہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔

حضرت حسنؓ نے اس حدیث کے مطابق عمل کرتے ہوئے اپنی خلافت کے چھ سات ماہ بعد حضرت معاویہؓ سے صلح کر لی اور آپ کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو جواب دیا کہ اگر خلافت حضرت معاویہؓ کا حق تھی تو ان کو مل گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں اپنے حق سے دست بردار ہو گیا۔ آپ کے اس اقدام کے نتیجے میں امت ایک بار پھر متحد ہو گئی۔ اس سال کو امت کی تاریخ میں عام الجمع کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ سال جب امت ایک بار پھر مجتمع ہو گئی۔ تاریخ میں کوئی ایسی مثال دکھائی جا سکتی ہے کہ اللہ کے لیے کوئی فرد سلطنت وحکومت سے دست بردار ہو جائے، امت کو جوڑنے کے لیے ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرے۔ اس وقت تو امت کا ہر گروہ خلافت، حکومت، اقتدار کی تگ ودو میں شب وروز مصروف ہے۔ سیاسی اسلام، اسلام کا نفاذ بذریعہ حکومت وقوت اس عہد کا مقبول ترین نعرہ ہے۔ مگر امت میں دور دور تک کوئی حسنی نہیں جو کسی دوسرے اسلامی گروہ، اسلامی جماعت، اسلامی قیادت کے حق میں دستبردار ہو کر

[1] صحیح بخاری مناقب الحسن والحسین والترمذی، ج ۲، ص ۲۱۸، فی المناقب

امت کو اکٹھا کر دے۔ یہ پارہ پارہ امت کیا کبھی مجتمع بھی ہو سکے گی؟ اگر نہیں تو اسے استخلاف فی الارض کیسے مل سکے گا؟ حضرت حسنؓ نہایت امیر آدمی تھے لیکن مال راہ خدا میں خرچ کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اپنے موزے بھی اللہ کے راستے میں خرچ کر دیئے اور صرف جوتے روک لیے۔ کیا عہد حاضر میں کوئی امیر دین دار اس طرزِ زندگی کو اختیار کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ جس امت پر دنیا کا غلبہ ہو اور اس قدر ہو کہ قرنِ اول کے طرزِ زندگی کا عصر حاضر میں تصور کرنا بھی محال ہو گیا ہو تو اس امت کو دنیا پر غلبہ کیسے عطا ہو سکتا ہے جو دنیا میں گرفتار ہے اور دنیا ہی جس کا ہدف اور مقصود ہے؟ اللہ نے اس امت کو اہل دنیا کے سپرد کر دیا ہے۔

خیر القرون کا خاص وصف مصیبتوں پر صبر اور اللہ سے بہترین مستقبل کی امید تھی۔ تمام صحابہ رسالت مآب ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرتے تھے کہ: "ما من مسلم تصیبه مصیبة فیقول ما امره الله به انا لله وانا الیه راجعون۔ اللّٰھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لي خیرا منها الا احلف الله له خیراً منها۔" جس صاحبِ ایمان پر کوئی مصیبت آئے (اور کوئی چیز فوت ہو جائے) اور وہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے وہ عرض کرے جو عرض کرنے کا حکم ہے کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم سب لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ مجھے میری اس مصیبت میں اجر عطا فرما (اور جو چیز مجھ سے لی گئی ہے) اس کی بجائے اس سے بہتر مجھے عطا فرما تو اللہ تعالیٰ اس چیز کی بجائے اس سے بہتر ضرور عطا فرمائے گا۔

ام المومنین حضرت سلمہؓ کو شوہر کے انتقال کے بعد عدت مکمل ہونے پر حضرت عمرؓ اور ابوبکرؓ نے رسالت مآب ﷺ کی جانب سے نکاح کا پیغام دیا تو آپ نے اسے قبول کرنے سے پہلے کچھ عذر پیش کیے۔ وقت کے پیغمبر اور حکمران کی جانب سے نکاح کی پیشکش ہو رہی ہے اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے لیکن اس لمحۂ مسرت میں بھی نفس کا کوئی تقاضا ایمان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ذات رسالت مآب ﷺ کے سامنے بھی اصل بات پیش کر دی جائے کیونکہ اگر کوتاہی ہوئی تو ایمان باقی نہیں رہے گا۔ یہ احساس ذمہ داری اس قرن کا خاص وصف تھا آج اس کی آرزو بھی نہیں ملتی۔ ان اعذار کے بیان کا مقصد رسالت مآب ﷺ کے سامنے اصل صورت حال پیش کرنا تھا کہ آپ اگر فیصلہ تبدیل کرنا چاہیں تو کر لیں اور یہ خوف کہ رسالت مآب ﷺ کی رفاقت حاصل ہو اور آپ کی خدمت میں کوتاہی ہو، حقوق کی ادائیگی نہ

ہو سکے، عذر یہ تھے۔ ا۔ میں بہت غیرت مند ہوں ۲۔ میرے کئی بچے ہیں ۳۔ میری عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے ۴۔ میرا کوئی ولی مدینہ میں نہیں ہے۔ یہ دیانت داری، صاف گوئی، سچائی ہر اس مومن کے لیے دین کو مطلوب ہے جو اسلامی انقلاب کی آرزو رکھتا ہے اور دنیا بھر سے اس آرزو کی خاطر جہاد کے لیے تیار ہے لیکن اپنے نفس کے خلاف جہاد پر قطعاً آمادہ نہیں۔ اسی لیے ہمارا خاندانی اور معاشرتی نظام مسلسل شکست وریخت اور زوال کا شکار ہے۔

ام المومنین حضرت زینبؓ نے رسالت مآب ﷺ کے حکم پر ایک غلام حضرت زید بن حارثہؓ جو رسالت مآب ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے اور علم و دین میں ممتاز ترین، انہیں بطور خاوند قبول کرلیا اور جب نباہ نہ ہوسکا تو مکہ کے دو بڑے خاندانوں کی عورت ہونے کے باوجود اپنے شوہر سے طلاق بھی بخوشی قبول فرمالی۔ رسالت مآب ﷺ نے ان کی دل جوئی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا اور یہ پیغام حضرت زیدؓ ہی لے کر گئے تو اللہ کی اس نیک بندی کا جواب یہ تھا۔ "ما انا بصانعة شيئاً حتىٰ او امر ربي فقامت الىٰ مسجدها"۔ [1]

یعنی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مَیں اللہ سے استخارہ ضرور کروں گی یہ کہہ کر اپنے مصلے پر کھڑی ہوگئیں۔ یعنی نماز شروع کردی۔ اللہ سے یہ تعلق تھا کہ سورۃ احزاب کی آیت نازل ہوئی اور آسمان پر آپ کا نکاح ہوا، اللہ رب العزت آپ کے ولی بن گئے۔ حضرت زینبؓ اس بات پر فخر کیا کرتی تھیں کہ میرا نکاح میرے اللہ نے کیا جب کہ دیگر ازواج مطہرات کا نکاح ان کے اولیاء اور اہلِ خاندان نے کیا ہے۔ "فقول زوجكن اهاليكن و زوجني الله من فوق سبع السموات۔"[2] حضرت زینب کا نکاح اللہ کے حکم سے آسمانوں پر ہوا تو سب سے شاندار ولیمہ بھی آپ کا کیا گیا۔ بخاری کی روایت ہے کہ اس شاندار ولیمے میں صرف ایک بکری ذبح کی گئی تھی۔[3] کیا روئے ارض پر کوئی ایسا صاحب حیثیت مسلمان عصر حاضر میں موجود ہے جو متمول بھی ہو، حکمران بھی ہو اور اس کے ولیمے میں صرف ایک بکری پر دعوت ولیمہ منعقد ہو سکے؟ یہ تصور کرنا بھی عصر حاضر کے دینی ذہن کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اگر اس بیان میں شک ہو تو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ہر دینی مزاج رکھنے والا مسلمان غور کرلے! (جاری ہے)

---

[1] صحیح مسلم جلد ا، ص ۴۶۱

[2] صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۱۰۴

[3] صحیح بخاری، ج ۲، ص ۷۷۷، صحیح مسلم، ج ا، ص ۴۶۱

تزکیۂ نفس

پروفیسر ایم اے رفرف

اپنے حصے کی شمع جلاتے رہو

ایک شخص سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اس نے دور سے دیکھا کہ کوئی شخص نیچے جھکتا ہے، کوئی چیز اٹھاتا ہے اور سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ وہ ذرا قریب جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ہزاروں مچھلیاں (Star Fish) کنارے پر پڑی تڑپ رہی ہیں۔ شاید کسی بڑی موج نے انہیں سمندر سے نکال کر ریت پہ لا پٹخا تھا اور وہ شخص ان مچھلیوں کو واپس سمندر میں پھینک کر ان کی جان بچانے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

اسے اس شخص کی بیوقوفی پر ہنسی آئی اور اسے کہا کہ تمہارے اس طرز عمل سے کیا فرق پڑے گا؟ ہزاروں مچھلیاں ہیں تم کتنی بچا پاؤ گے؟ یہ سن کر وہ شخص نیچے جھکا، ایک تڑپتی مچھلی کو اٹھایا اور سمندر میں اچھال دیا۔ مچھلی پانی میں جاتے ہی تیزی سے تیرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اُس نے سکون سے دوسرے شخص کو کہا ''اس مچھلی کو تو فرق پڑا ہے''۔

مطلب یہ کہ ہماری چھوٹی سی کاوش سے بھلے مجموعی حالات تبدیل نہ ہوں مگر کسی ایک کے لیے تو وہ فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے۔ لہٰذا دل بڑا رکھیں اور اپنی طاقت وحیثیت کے مطابق اچھائی کرتے رہیں۔ اس فکر میں مبتلا نہ ہوں کہ آپ کی اس کوشش سے معاشرے میں کتنی تبدیلی آئے گی بلکہ یہ سوچیں کہ آپ نے اپنے حصے کا حق کتنا ادا کیا؟

تفہیم مغرب

سید خالد جامعی

مغرب کے تضادات

* کوڑا پیدا کرنا جرم نہیں مگر کوڑا پھینکنا بہت بڑا جرم ہے۔

* سگنل توڑنا بہت بڑا جرم ہے مگر ماں باپ کو اولڈ ہوم میں اور بچے کو ڈے کیئر سنٹر میں پھینکنا جرم نہیں۔

* جانوروں پر ظلم کرنا جرم ہے لیکن فلسطین، افغانستان، لیبیا، ویت نام، کمبوڈیا، یوکرین میں انسانوں پر ظلم کرنا جرم نہیں۔

* مغرب امن کا علمبردار ہے مگر پہلی اور دوسری جنگ عظیم کس نے شروع کی؟ یورپی قوم کے کروڑوں انسانوں کو قتل کرنے والے مسلمان نہیں یورپی ہی تھے۔

* دودھ میں پانی ملانا بہت بڑا جرم ہے مگر زمین میں، ہوا میں، پانی میں، سانس میں آلودگی جرم نہیں۔ دودھ میں پانی کی ملاوٹ زہر نہیں ہے لیکن صاف ہوا کو آلودہ کرنا ہوا میں زہر کو شامل کرنا ہے۔ دودھ میں پانی ملانے کی سزا ہے مگر صاف ہوا کو زہر آلود کرنے کی کوئی سزا نہیں۔

* عورت کو آزادی ہے کہ وہ زنا کرے۔ اس کو آزادی ہے کہ وہ رحم مادر میں بچے کو قتل کرے یعنی اسقاط کرائے۔ دنیا بھر میں امن اور عافیت کے علمبردار مغرب میں ہر سال کروڑوں بچوں کو رحم مادر میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کے بھی انسانی حقوق ہیں لیکن بچوں کو قتل کرنا جرم نہیں بلکہ عورت کی آزادی کا تقاضا ہے۔ بچہ عورت کی آزادی کی راہ میں حائل ہوتا ہے لہٰذا اس رکاوٹ کو ختم کر دیا جائے۔

تفہیم مغرب　　　رضی الدین سید[۱]

مغرب کی تحریکِ مساواتِ مرد و زن

ایک تاریخی مطالعہ

تحریکِ مساواتِ مرد و زن آج دنیا کی سب سے بڑی عفریت ثابت ہو رہی ہے۔اس کا آغاز آج سے تقریباً دو سو سال پہلے یورپ میں ہوا تھا۔واقعہ یہ ہے کہ ہر منفی تحریک کا آغاز سدا سے یورپ ہی میں ہوتا رہا ہے کیونکہ مذہب ان کے ہاں ہمیشہ ہی نا قابلِ توجہ گردانا جاتا رہا ہے۔ اگر آپ ان کی اس تحریک کا مرحلہ وار مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ لگے گا کہ تحریکِ مساوات کے علم برداروں کی جانب سے خواتین کے حق میں اٹھایا جانے والا ہر اگلا قدم، ان کی قوم، معاشرے، مذہب، اور خود ان کی خواتین کے لیے، اٹھائے گئے ان کے ہر پچھلے قدم سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اپنی دانست میں تو اگرچہ سرخیل حضرات یہی سمجھتے رہے کہ وہ کامیابیوں سے دو چار ہو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود بھی اور خواتین کو بھی وہ بدترین زوال سے دو چار کر رہے تھے۔اگرچہ قصہ بہت طولانی ہے لیکن تفہیم کی خاطر ذیل میں ہم ان کے مرحلہ وار اقدامات کو محض نکات کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ حقوقِ نسواں کی تحریک کے لیے بنیادی کردار دراصل اس دور کی برپا شدہ دو عالمی جنگوں نے ادا کیا تھا۔محاذ پر جانے کے لیے محلے محلے ''رنگروٹ مراکز'' کھلے ہوئے تھے کیونکہ میدان میں افرادی قوت کی شدید ضرورت پائی جاتی تھی۔لیکن بھرتی ہو کر جو مرد بھی محاذ پر جاتے تھے، ان میں سے بہت کم ہی ایسے تھے جو زندہ بچ کر واپس آتے تھے۔اور جو آتے بھی تھے تو ان کی بڑی تعداد اپاہج اور معذور ہوا کرتی تھی۔ ہر گھر کے ایک دو مرد ضرور ان جنگوں میں کام آ گئے تھے، چنانچہ تقریباً ہر گھر میں ماتم بپا تھا اور گلی گلی آہ و بکا جاری تھی۔ایک دو ضعیف مردوں کے علاوہ گھروں میں اب صرف تین چار خواتین اور چند چھوٹے چھوٹے بچے ہی باقی رہ گئے تھے۔سب سے بڑا سوال ان زندہ رہ جانے والوں کے نزدیک ان کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا

[۱] دانشور، مصنف، کراچی، national.a.research@gmail.com

تھا۔آمدنی اچانک جب صفر پر پہنچ جائے تو اتنا بڑا گھر کیسے چلے اور کیونکر چلے؟ واضح رہے کہ اس دور میں خاندانی منصوبہ بندی جیسے کسی عجیب وغریب لفظ سے پورا یورپ قطعی ناآشنا تھا۔کنبے بھی ان کے بڑے بڑے ہوا کرتے تھے۔

۲۔ معاش کے بعد عورتوں کے سامنے ایک حقیقی سوال یہ بھی آن کھڑا ہوا کہ ان کے جوجسمانی تقاضے ہیں انہیں اب کون پورے کرے گا؟ کمروں میں بیویاں تو موجود تھیں لیکن جیون ساتھی ان کے اب وہاں کہیں موجود نہ تھے۔جذبات تو آخر جذبات ہیں۔اور جذبات تو سب ہی کے اندر موجود ہوتے ہیں۔مرد ہوں یا عورتیں! اس لیے اس خلاء نے بھی ان کے اندر ایک قدم آگے بڑھانے کی انجانی تحریک پیدا کی۔

۳۔ سوئے اتفاق یا حسنِ اتفاق، انہی دنوں یورپ میں صنعتی احیاء نے بھی جنم لینا شروع کر دیا تھا۔کارخانوں میں کام کرنے والے کثیر افراد کی ایک ساتھ ضرورت پائی جاتی تھی جہاں بڑی بڑی مشینیں نصب تھیں۔خود کو رواں دواں رکھنے کی خاطر وہ افرادِ کار کی طلب رکھتی تھیں۔ چنانچہ صنعت کاروں نے جنگی بھرتی کے مراکز کی طرز پر اپنی اپنی مشینوں کے لیے بھی 'رنگروٹ بھرتی' مراکز کھول دیئے اور آواز لگائی کہ ''جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں''۔

☆۴۔صدموں اور لاوارثیت کی ماری عورتوں کے لئے یہ گویا ایک قدرتی انعام تھا۔پہلے تو روایتی شرم وحیا نے انہیں کھینچے اور باندھے رکھا۔لیکن آخر کب تک؟۔ پیٹ تو حیلے بہانے نہیں سنتا،انگریزی محاورہ کہتا ہے کہ(خالی پیٹ کچھ نہیں سنتا)Hungry stomach has noears چنانچہ اپنے رزق کے حصول لئے وہ آخر کار بیتابانہ باہر نکلیں۔اس کے بعد تو پھر وہی اصول ان پر لاگو ہوگیا کہ 'گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی عورت پر مصائب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے'۔

۵۔ عورت کو جب ہر ماہ لگی بندھی آمدنی ملنے لگی تو سکون واطمینان کے جذبات کے ساتھ ساتھ اندرونی طور پر اس پر ایک گونہ خوداعتمادی کا احساس بھی طاری ہوا۔دوسری طرف اس کے اندر اپنے'' کچھ ہونے'' کی قوت کا خیال بھی اجاگر ہوا۔پہلے اگر وہ کچھ نہیں تھی تو اب وہ یکا یک بہت کچھ بن گئی۔چنانچہ ایک طرح کا زعم بھی اس میں پیدا ہونا شروع ہوگیا۔

۶۔ حاصل شدہ رقم سے ایک طرف اس نے اپنے گھر کو چلانا شروع کیا اور دوسری طرف

خودکو بنانا سنوارنا اورنکھارنا بھی شروع کردیا۔ باہر کی دنیا تو یوں بھی ہر ایک سے بننے ،سنورنے اور سجنے کا تقاضا کرتی ہے۔لیکن معاملہ اگرعورت کا ہوتو بات اس سے بھی کہیں آگے جا کرٹھہرتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں پیسے آنے لگتے ہیں (خصوصاً وہ جو اس کی اپنی ذاتی آمدنی ہو)،تو سجنے ،سنورنے اور بننے کی اس کی خواہش کچھ اور ہی سِوا ہوجاتی ہے۔ یہ اس کی فطرت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

یوں ایک سادہ ،معصوم ، اور شرم وحیا کا پیکرِ وجود، غیرمحسوس طور پر چمکتی ،جھلملاتی ، اور پرکشش صنفی دعوت کے روپ میں ڈھلنے لگا۔ باہر کی دنیا اب اسے بہت بھانے لگی ، اپنا آپ اسے اب بہت اچھا لگنے لگا!

۷۔ مشینوں اور دفتروں میں مرد کارکنوں کے ساتھ آٹھ آٹھ، دس دس گھنٹوں تک ایک ساتھ کام کرتے ہوئے دونوں کے درمیان شیطان نے ازخود داخلہ بنالیا،اس شعر کی مصداق کہ ؎

دیوار کیا گری میرے کچے مکان کی
لوگوں نے اس کے صحن میں رستے بنا لیے

کہیں مرد اور عورت کا ہاتھ آپس میں ٹکرا گیا، کہیں جسم سے جسم باہم مس ہو گئے، کہیں نگاہیں چپکے چپکے ایک دوسرے کے سراپا کا جائزہ لینے لگیں اور کہیں تخلیے میں کھڑے کھڑے دو چار جملے ایک دوسرے کے ساتھ ادا ہو گئے۔ صبح وشام کے مصافحے تو بہرحال ان سب کے درمیان ایک طے شدہ بات تھی۔ جھجک اور شرم اب آہستہ آہستہ دونوں سے،مردوں سے عموماً اور عورتوں سے خصوصاً، رخصت ہونے لگی۔

۸۔ میز پر سامنے، یا مشین کے پاس، جوان وحسین صنفِ نازک موجود ہو، اور مرد اس کی تعریفیں نہ کرے؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ مرد کی ہمدردانہ نگاہ اور چند حوصلہ آور جملوں سے پھر عورت کے دل میں بھی یہ خیال جاگزیں ہونے لگا کہ فلاں فلاں مرد اس پر دوسرے مرد ساتھیوں سے زیادہ مہربان ہے۔ اور خلوص بھی اس کے اندر دوسروں سے زیادہ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں خدا کے بیٹے ''مسیح'' کی جگہ وہاں محبت کے دیوتا'' کیوپڈ'' (Cupid) نے جگہ بنالی اور آرام سے آ کر ان کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ فریقین میں محبت کی آگ تیز ہونے لگی۔ کبھی لڑکا اور لڑکی باہر گھومنے لگے اور کبھی ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلفانہ آنے جانے لگے۔

۹۔ صنعتی مالکان کو اندازہ ہوا کہ ملازمت کی ضرورت کے باعث صنفِ نازک کی شکل میں انہیں ایک اچھا شکار ہاتھ آ گیا ہے۔انہیں پتہ تھا کہ لڑکیاں معاشی طور پر مجبور ہیں اور وہ چاہیں تو انہیں مزید مجبور بھی کر سکتے ہیں۔چنانچہ ان کے جبری جسمانی استحصال کے سلسلے کا بھی اجراء ہو گیا۔دوسری طرف بعض جری مگر نادان لڑکیوں نے مالکان کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرنے ،اور ان سے ملازمت کے بیش از بیش فوائد سمیٹنے کی خاطر،خود بھی اپنے آپ کو ان کی جانب زیادہ راغب کرنا شروع کر دیا۔صورتِ حال پھر یہ بن گئی کہ صنعتی مالکان کی جانب سے ان کی جانب یہ خاموش پیغام مسلسل ارسال کیا جارہا تھا کہ یا تو ہماری بات مان لو یا پھر ملازمت سے دستبردار ہو جاؤ۔خاتون سوچنے لگی کہ وہ ملازمت چھوڑے تو کیسے چھوڑے؟،اور چھوڑے تو کہاں جائے؟ کیونکہ دوسرے کارخانے کا مالک بھی تو بالکل اسی کا بھائی ثابت ہوگا۔

۱۰۔ ادھر مفاد پرستوں نے عورت کے حسن،اس کی اداؤں،اور اس کی قیمت کی بناء پر اسے مزید پھانسنے کی کوشش کی اور تعمیری کاموں سے ہٹا کر اسے تفریحی مشغلوں میں الجھا دیا۔نعرہ لگایا گیا کہ عوام کو پُرمشقت و بوتر ملازمت کے ساتھ ساتھ 'ذہنی سکون' بھی فراہم کیا جانا لازم ہے۔چنانچہ اس کی خاطر انہوں نے شہروں میں جگہ جگہ نائٹ کلب اور سنیما گھر کھولنے شروع کیے اور ان میں نوجوان عورتوں کو عریاں اداکاری،نیم عریاں رقص،اور شہوت بھرے گیتوں کی ادائیگی میں مصروف کر دیا۔عورت کے لئے یہ ایک بہت پر کشش مصروفیت ثابت ہوئی کیونکہ اس سے اسے نہ صرف یہ کہ بھاری رقم مل رہی تھی بلکہ چرچے بھی اس کے دور دور تک پوری قوم میں پھیل رہے تھے۔پیشہ ہی ایسا تھا کہ اس میں اسے اپنے کپڑوں کو مختصر سے مختصر کرنا اور میک اپ کے ساتھ حسین سے حسین تر نظر آنا ناگریز تھا۔وہ اگر یہ نہ کرتیں تو ان کی مارکیٹ ویلیو صفر ہو جاتی۔

۱۱۔ اس مصروفیت نے عورتوں کو گویا پھر ان راستوں پر ڈال دیا جہاں عزت وعصمت ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہی۔ذرائع ابلاغ میں زیادہ سے زیادہ داخل رہے جانے اور دولت کے ڈھیر پر ڈھیر جمع رکھے جانے کی خاطر ان کے پاس قدرتی راستہ بچا ہی یہ تھا کہ وہ 'بولڈ سے بولڈتر' ہوتی چلی جائیں اور اپنی شرم وحیا کا زیادہ خیال نہ کریں۔چنانچہ ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد نے اس مقصد کے لیے از خود 'ناپاک مراکز' کی راہ اپنائی۔اس دھندے کو سب سے زیادہ فروغ یہودیوں نے دیا کیونکہ ہر قسم کے کالے اور سیاہ دھندوں کا کاروبار ان کے مزاج کو ہمیشہ

سے راس آ تا رہا ہے۔امریکہ میں انہوں نے 'ہالی وڈ' کے نام سے پہلا فلمی اسٹوڈیو کیا کھولا کہ اس کے بعد تو پھر جیسے فضا میں ایک دوڑسی لگ گئی۔نگارخانوں کی چُندھیا دینے والی چکا چوند کو دیکھ کر وہ معصوم سی کم عمرلڑکی جو پہلے کبھی گھر ہی میں رہنے کو ترجیح دیتی تھی، کچھ ذاتی خواہش اور کچھ ترغیب و ترہیب کے باعث فلمی دنیا کی رنگینیوں میں اس طرح ڈوب گئی کہ نہ صرف یہ کہ اسے اپنے نفع نقصان کا کچھ ہوش نہ رہا بلکہ اپنے دیرینہ مذہب، اخلاق اور والدین سب کو اس نے ایک ساتھ الوداع کہہ دیا۔

۱۲۔ کارخانے اور صنعتی ادارے پھلنے پھولنے لگے تو انہیں اپنی مصنوعات کے فروغ کے لئے اشتہارات کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔عورت تو پھر اس کام کے لئے سب سے زیادہ ہی مناسب چیز سمجھی گئی۔جو شے کسی اور وجہ سے نہ بِک سکے، وہ عورت کے حسن کے باعث تو ضرور ہی کوئی نہ کوئی قدرو قیمت بنا لے گی۔چنانچہ انہوں نے عورت کا اس طرح سے بھی استعمال شروع کر دیا۔یوں عورت ایک نئی راہ، ماڈل گرل کے کاروبار، پر بھی مزید چل پڑی۔مردوں کے مختلف عیارانہ اور ''واعظانہ'' پھندوں کے باعث وہ جب اس دلدل میں مسلسل پھنستی ہی چلی گئی تو اس کے دام لگانے والوں نے ادھیڑ اور بوڑھی عورتوں کی جگہ نوجوان و پرکشش لڑکیوں کو مقام دینا شروع کر دیا۔(سیکریٹری کی سیٹ کے لیے آج بھی اشتہاروں میں صاف صاف مطالبہ کیا جاتا ہے کہ صرف وہ خواتین درخواست دیں جو نوجوان اور پُرکشش ہوں)۔

۱۳۔ ماڈل گرلز جس قدر بے باک اور اچھے نقش و نگار کی حامل ہوتیں، انہیں اسی قدر زیادہ معاوضہ ملتا۔لیکن کام کے اوقات میں وہ بس محض آجر کی غلام ہی رہتیں۔وہ ان سے جس طرح کا چاہتا کام لیتا۔انہیں لٹاتا، جھلاتا، تیراتا، (درختوں) پر لٹکواتا، بارشوں میں نہلواتا، اور جیسے چاہتا جملے ادا کرواتا وغیرہ۔یہ اوقات بس صرف آجر کے تھے اور ماڈل گرل اس کی کٹھ پتلی ہی تھی۔

۱۴۔ پھر یہ نعرہ بھی اسے عطا کیا گیا کہ جسمانی لطف کا حصول اس کا فطری حق ہے جس مقصد کے لئے وہ کسی کے ساتھ بھی دوستی کرسکتی اور 'ڈیٹ' لے سکتی ہے۔عورت کو یہ بھی جتایا گیا کہ اُدھر مرد کا بھی حق ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرے۔''اس لئے کسی کو بھی کسی کے ساتھ انکار نہیں کرنا چاہئے۔ہر مرد ہر عورت کے لئے اور ہر مرد ہر عورت کے لئے''۔اسے باور کرایا گیا کہ اخلاق، تہذیب، اور مذہب سب کچھ ڈھکوسلا ہیں اور اسے قید رکھنے کا محض ایک 'مولویانہ'

یا 'پادریانہ' بہانہ ہیں!۔

۱۵۔ عورت کی مصروفیت جب ہر میدان میں بڑھتی چلی گئی تو اب اس کے سامنے سوال بال بچوں کے پالنے اور پرورش کرنے کا آیا۔ بچوں کی پرورش کے لئے تو خاصے وقت، محنت، اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ملازمت اور دیگر مصروفیات کے باعث اب عورت کے پاس وقت کہاں تھا؟ شام کو نِگار خانوں اور ملازمتوں سے واپسی کے بعد وہ تھک کے چور اور چڑ چڑی ہو جاتی تھی۔ ایک طرف گھر کے بقایا کام اور دوسری طرف اس کے بال بچے۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ بھی کوئی آزادی ہے کہ گھر واپسی کے بعد دوسری 'ملازمتیں' بھی اس کے انتظار میں رہیں۔ اصلی ملازمت تو وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کے بہت سارے مسائل کا حل وہی ملازمت تھی۔ چنانچہ اب ملازمت کی جگہ اس نے خود بچوں ہی سے جان چھڑا لینے کی سوچ اپنائی۔ پہلے تو اس سلسلے میں اس کے لئے 'بے بی ڈے کیئر مراکز' کھولے گئے۔ لیکن مسائل کا مکمل حل تو یہ بھی ہرگز نہ تھا۔ چنانچہ اب درمیان میں ایک یہودی دانشور 'مالتھس' مدد کو آیا جس نے مستقبل میں آبادی کے زیادہ اور خوراک کے کم ہو جانے کا 'ہوّا' پیش کر کے آبادی کو کم کرنے کی ایک دوسری مضبوط عالمی مہم چلائی۔ اس نے زور دیا 'کہ انسانی پیداوار' کم کی جائے اور کنبے کو مختصر کیا جائے'۔ مقصد اس ساری عیارانہ مہم کا یہ تھا کہ مرد و عورت دونوں، اپنی اپنی ذہنی، جسمانی اور مالی عیاشی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ کریں۔ مالتھس نے دنیا بھر کو یہ مضبوط و خوب صورت نعرہ دے کر گویا احسان سے نواز دیا کہ ''بچے کو قربان کردو مگر عیاشی کو قربان نہ کرو''۔

موجودہ آزادانہ اور ملازمتانہ صورتِ حال میں ہر سال نئے بچے کی آمد سے عورت دل برداشتہ بھی ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ' آبادی گھٹاؤ اور کنبہ مختصر کرو' کے اس دالفریب نعرے نے اس کے دل کو جیسے موہ لیا اور اولاد کو تج دینے جیسے اقدام پر وہ خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ اولاد جو کسی شادی شدہ عورت کے لئے سدا سے سرمستی و خود اعتمادی کا ذریعہ بنتی رہی ہے، وہ اب اس دور کی جدید عورت کو سراسر بوجھ لگنے لگی۔

۱۶۔ ناجائز تعلقات کے نتیجے میں جنم لینے والی متوقع اولاد کے خطرے سے بچے رہنے کی خاطر اب ضرورت لاحق ہوئی کہ اس کے لئے مانعِ حمل ادویات و آلات بھی سامنے لائے جانے

چاہئیں تا کہ دوطرفہ عیاشیوں میں کسی قسم کی بھی کوئی جھجک اور رکاوٹ باقی نہ رہے۔مفکرین کے مطابق ان میں سے کسی کو بھی اولاد کا خوف،خصوصاً عورت کو تو ہرگز باقی نہیں رہنا چاہئے۔اس طرح جب تحدیدِ اولاد کے وسائل عام ہوگئے اور اولاد کا خوف ذہنوں سے نکل گیا تو شعوری طور پر خواتین کو احساس ہوا کہ اب جا کر کہیں ان کی آزادی صحیح معنوں میں مکمل ہوئی ہے۔

١٧۔ عورت چونکہ اب زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہوتی جا رہی تھی، نیز دانشور اور ادیب پیچھے اس کی پیٹھ ٹھونکنے کو ہر گھڑی کھڑے بھی رہا کرتے تھے،اس لئے اب دونوں طرف سے نعرہ لگایا گیا کہ حکومتی وسیاسی ایوانوں کو بھی عورتوں سے پُر کرنا چاہیے اور ان کا حصہ بھی وہاں مردوں ہی کی مانند لگایا جانا چاہیے۔'سیاست صرف مرد کریں اور وہی حکومت بھی چلائیں،تو یہ کوئی انصاف نہ ہوا؟۔ہم خواتین کوئی عقل میں ان سے کم تھوڑی ہیں؟'مطالبہ کرتے کرتے اور تحریک چلاتے چلاتے حکومتوں کو بھی بالآخر ان کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے۔یوں وہ دفتروں،کارخانوں،تعلیمی اداروں،نائٹ کلبوں،فلمی میدانوں،اور کھیل کود کے میدانوں سے ہوتی ہوئی سیاست کے خاردار کارزاروں میں بھی داخل ہوگئی۔

١٨۔ اپنی آزادی کے لئے مغربی خواتین نے طویل جدوجہد کی تھی، بے حد وحساب صعوبتیں برداشت کی تھیں،مظاہرے منظم کئے تھے،قید و بند کی سزائیں بھگتی تھیں،اور کلیساؤں اور حکمرانوں کی مشترکہ نفرتوں کو سہا تھا لیکن ہمت بہرحال نہیں ہاری تھی۔کیونکہ ان کے پیچھے یہودی دانشوروں،ادیبوں نیز شاعروں کی اکساہٹ اور حوصلہ افزائی شامل تھی۔چنانچہ مقصد کے حصول کے ہر ہر مرحلے کے بعد وہ مزید سے مزید کا نعرہ لگاتی چلی گئیں۔

آخر کار ڈیڑھ دوسو سالوں کی مطلوبہ، بلکہ اس سے بھی زاید آزادی کے حصول کے لطف کے بعد پھر جا کر انہیں کہیں خیال آیا کہ اب ذرا ایک جائزہ انہیں اپنے نفع و نقصان کا بھی تو کچھ لے لینا چاہیے۔چنانچہ اس جائزے کے بعد ہی جا کر انہیں کہیں محسوس ہوا کہ بظاہر تو وہ جنگ جیت چکی ہیں لیکن جیتی ہوئی اس جنگ میں وہ دراصل نقصان میں زیادہ رہی ہیں۔ذمے داریاں ان پر دوہری آن پڑی ہیں،گھر ان کے برباد ہو گئے ہیں،ان کا اپنا سچا خیر خواہ بھی کوئی نہیں رہا ہے،ان کی مادرانہ گودیں بھی زمانے سے معصوم بچوں کو ترس رہی ہیں،وہ صرف پیسے کمانے اور لوگوں کا دل لبھانے کی مشینیں بن کے رہ گئی ہیں،معاشرہ انہیں اب بھی کسی بڑی ذمے داری دینے کا خطرہ

مول لینے کو تیار نہیں ہے، اور ان کی غیر بارآوری کے نتیجے میں قوم کی افرادی قوت بھی مسلسل گھٹتی چلی جارہی ہے۔ چنانچہ اب جا کر انہیں صحیح انداز ہوا کہ یہ تو سب کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اس لیے انہوں نے دہائی دی کہ ''مژگاں تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا'' اور یہ کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ، جو سنا افسانہ تھا

اس لئے اب سب کے ہاں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ ان کے اہم مفکر مرد و خواتین چیخنے لگے کہ اس طرح تو حریف مسلم تہذیب ان پر حاوی ہو جائے گی اور اپنے ہی شہر میں وہ لوگ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے! حقیقتاً بھی مغربی ممالک کی ذاتی آبادی اب گھٹتی چلی جارہی ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اب وہاں 'واپس گھر کو چلو'، 'اور آبادی میں اضافہ کرو' جیسی مہمیں دوبارہ اٹھنی شروع ہو گئی ہیں۔ یہ عورتیں اب گویا دوبارہ اپنے گھروں کو رونق بخشنا چاہ رہی ہیں۔

یہ تھی مرحلہ وار وہ تفصیل جن سے گزر کر مغربی خواتین آج اس موجودہ دور تک پہنچی ہیں۔ خود تو انہوں نے اپنے آپ کو برباد کیا ہی ہے لیکن دنیا بھر کی خواتین کو بھی انہوں نے جہنم کی آگ میں جھونک دیا ہے۔

جامعیت کے ساتھ یہ کہنا بہت درست ہے کہ خواتین کے حقوق کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہا جائے، کچھ بھی اقدام کیے جائیں، کتنی ہی کتابیں لکھ لی جائیں، اور کتنی ہی کانفرنسیں برپا کر لی جائیں، یہ بات بہرحال طے ہے کہ تحریک آزادئ نسواں کا نتیجہ بہرحال:

☆ سوائے بدکاری، گناہ، اور شہوت پرستی کے کچھ اور نہیں نکلتا۔

☆ بہترین حقوق حاصل کرنے کے باوجود عورت کو بدترین مظالم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

☆ اسے اپنے خاندان کی تباہی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

☆ سوائے صنفی، استحصالی اور دلچسپ آلۂ کار کے سوا وہ اور کسی صورت میں معاشرے کے سامنے نہیں آتی۔ اور

☆ آخری عمر میں اپنی قیمتی صحت کو برباد کر کے وہ تنہائے محض بھی رہ جاتی ہے۔

علامہ اقبال کے نظریات

علامہ اقبال نے بہت پہلے ہی پیشین گوئی کردی تھی کہ ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

لندن و جرمنی میں رہائش کے دوران شاعر مشرق نے قدرتی طور پر وہاں کی عورتوں کی آزادی اور ان کے چال چلن کا بھی پوری طرح مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ دوسرے دانشوروں کے برعکس ان کے خیالات خواتین کے بارے میں بہت حقیقی ہو گئے تھے۔ متعدد مرتبہ انہوں نے مغربی خواتین اور ان کی بڑھتی ہوئی آزادی کے خلاف برملا اظہارِ رائے کیا تھا۔ ان کے نزدیک مغربی خواتین آزادی نہیں حاصل کر رہی ہیں بلکہ خودکشی کا راستہ اختیار کر رہی ہیں۔ اس تحریک کی ابتدا کے بارے میں انہوں نے تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ (یورپ) میں ''جنگ سے پہلے نہ یہ ذوقِ عریانی تھا (اور) نہ یہ حسن کے مقابلے۔ یہ (سب کچھ دراصل) جنگ کا نتیجہ ہیں۔ جنگ سے اگر ایک طرف صفاتِ عالیہ کو تحریک ہوتی ہے تو دوسری جانب ادنیٰ سے ادنیٰ، اور سفلی سے سفلی جذبات (بھی) ابھر آتے ہیں''۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''یوں بھی قتل اور خوں ریزی کا نتیجہ اجتماعی لحاظ سے ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ قومیں بے دریغ ایک دوسرے پر ظلم و ستم کرتی ہیں۔ انسان جب بے دردی اور سفاکی کے ہولناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، تو سمجھتا ہے زندگی نام ہے محض غلبہ و تغلب کا۔ اس میں کوئی اخلاقی قانون کام نہیں کرتا۔ اور نہ دنیا کسی اخلاقی نظام کے سہارے چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ پر پابندیاں عائد کر دیں اور ایسے قوانین وضع کر دئے جن سے اخلاقِ عالیہ کی حفاظت ہوتی ہے''۔ [۱]

اسی طرح لندن کے دورے کے دوران انہوں نے وہاں کی مقامی خواتین کے ساتھ ایک اجتماع میں مغربی عورت کے بارے میں بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ ''افسوس اس قوم پر جس کی عورتیں Excitement کی تلاش میں رہتی ہیں''۔ پھر انہوں نے وہاں موجود خواتین سے یہ گزارش بھی کی تھی کہ انگلستان کی عورتوں کا فرض ہے کہ وہ (اپنی) آئندہ نسل کو دہریت اور مادیت

---

[۱] اقبال کے حضور میں، حصہ اول صفحہ ۱۶۸، از نذیر نیازی۔ اقبال اکیڈمی کراچی

کے چنگل سے بچائیں''۔[۱] ایک اور موقعہ پر مسلم خواتین کے بارے میں انہوں نے یہ تجزیہ بھی کیا تھا کہ ''بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں مسلمان خواتین (بھی) اپنا دین کھو رہی ہیں''۔[۲] علامہ گویا یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ مسلمان کے ہاتھوں سے جب ان کی اصل بنیاد (دین) ہی رخصت ہو جاتی ہے تو پھر دنیا کی ہر برائی اسے خوشنما لگنے لگتی ہے۔ جیسا کہ دنیا کا ماحول ہمیں اب تک بتا تا چلا آرہا ہے۔ علامہ نے عورتوں کے بارے میں ایک بار یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ ''وہ عورت جو کمالِ حُسن کے باوصف پندارِ حُسن سے مطلق مبرا ہو، (یعنی حسن رکھنے کے باوجود ناز و غرورِ حسن سے مطلق بے نیاز ہو)، میرے نزدیک وہ مخلوقاتِ ارضی میں دلکش ترین شے ہے۔''[۳] اپنے انہی جذبات کی مزید وضاحت علامہ نے ایک دوسرے شعر میں بھی یوں کی ہے۔

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

یعنی چونکہ ہندوستان کی عورتیں شرم و حیا کی پیکر اور اپنی آبرو کی محافظ ہوا کرتی ہیں (یہ بھی ہمارے قدیم دور کے اوصاف تھے جو بہر حال اب اتنے مثالی نہیں رہے ہیں)، اس لئے مغرب کی آبرو باختہ و بے باک عورتوں میں مجھے ان مشرقی خواتین جیسی کوئی کشش قطعی نظر نہیں آئی۔ ذیل کے مزید اشعار بھی علامہ اقبال کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

یہ ڈراما دِکھائے گا کیا سِین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیّت جو ہے خود لبِ گور

---

[۱] سفر نامہ اقبال، محمد حمزہ فاروقی، صفحہ ۵۵،۵۱
[۲] اوراقِ گم گشتہ، رحیم بخش شاہین، صفحہ ۳۰۱، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور
[۳] 'عروجِ اقبال'، پروفیسر ڈاکٹر افتخار صدیقی، صفحہ ۴۷۳، طباعت ۱۹۸۷، بزمِ اقبال لاہور

فکرودانش　　　　　　　　　　　　　　　　حافظ محمد عمران طحاوی

کیا ہمارے دینی حلقے غیر مؤثر اور ناکام ہو چکے ہیں؟

'مجلس فکرودانش' کے مجلس مذاکرہ میں اہل علم کا تبادلۂ خیال

'مجلس فکرودانش' جس کا آغاز چند ماہ پہلے پروفیسر ڈاکٹر مبشر حسین (شیخ زائد اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی) اور مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب نے مل کر کیا تھا، اس کا دوسرا اجلاس ۱۲ نومبر ۲۰۲۲ء کو سہ پہر ۴ بجے 'البرہان' کے دفتر ۱۵ شیر شاہ بلاک نیوگارڈن ٹاؤن لاہور میں ہوا۔ شرکاء سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مندرجہ ذیل موضوع پر غور کر کے آئیں:

۱۔　کیا آپ پاکستان کا دینی مستقبل شاندار دیکھتے ہیں یا مخدوش؟ آپ کا جواب جو بھی ہو اس کے دلائل۔

۲۔　کیا آپ کی رائے میں پاکستان کے دینی حلقوں (مساجد، دینی مدارس، تبلیغی ودعوتی تحریکیں، دینی سیاسی جماعتیں، تصوف کے حلقے، اصلاحی ادارے، علماء کرام اور اسلامی سکالرز....) کی حکمت عملی اور ان کے لائحہ عمل مفید، مؤثر اور کامیاب ہیں؟

اگر یہ مفید اور مؤثر ہیں تو اس کے دلائل؛ اور اگر آپ کی رائے میں یہ مؤثر نہیں ہیں تو ان میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور ان کے لائحہ عمل کو کیسے مفید، مؤثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے؟

ڈاکٹر مبشر صاحب نے مدیر البرہان سے درخواست کی کہ وہ اس سیشن میں افتتاحی گفتگو سے مجلس کا آغاز کریں۔

مدیر البرہان نے کہا کہ اس موضوع پر دونوں جہات سے غور کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے دینی حلقوں نے بلاشبہ کچھ کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں اور وہ بہت کچھ نہیں بھی حاصل کر سکے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے پانی سے بھرے آدھے گلاس کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ آدھا بھرا ہوا ہے (جو باعث تشفی ہے) اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ آدھا خالی ہے (تو کیوں خالی ہے؟)۔ انہوں نے کہا کہ گلاس جو آدھا بھرا ہوا ہے اس کا ذکر تو تحصیل حاصل ہے لہٰذا غور اس پر ہونا چاہیے

کہ گلاس آدھا خالی کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ معروضیت سے یہ سمجھتے ہیں کہ دینی حلقوں کو اپنے منہاج، حکمت عملی اور لائحہ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے کیونکہ ان کی موجودہ پالیسیاں زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری دعوتی وتبلیغی جماعتوں، دینی مدارس، مساجد اور تصوف کے حلقوں کا تصور دین ان معنوں میں جزوی اور ناقص ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کو اپنا دائرہ کار نہیں سمجھتے۔ اور یہی حال دینی سیاسی جماعتوں کا ہے کہ وہ فرد کو بدلے بغیر اجتماعی اسلامی تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں جو خلاف نقل وعقل ہے۔ جب تک فرد میں تبدیلی نہیں آئے گی معاشرے اور ریاست میں تبدیلی آ ہی نہیں سکتی کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں۔

مدیر البرہان نے کہا کہ اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے لائحہ عمل مرتب کرتے ہوئے دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ہم مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو رد کریں اور اسلامی اصولوں پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہونے والے سارے اداروں کی تشکیل نو کریں۔ دوسرے یہ کہ دینی حلقے فرقہ واریت اور مسلک پرستی کے گرداب سے نکلیں، مسلک کو دین سمجھنا چھوڑ دیں اور مشترکات پر متحد ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی تمہیدی گفتگو کے بعد ڈاکٹر مبشر صاحب نے شرکاء کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ حافظ ڈاکٹر حسن مدنی نے کہا کہ دینی اداروں خصوصاً دینی مدارس کی خدمات کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو آج معاشرے میں اسلام بھی نہ ہوتا۔ پروفیسر ارشد جاوید صاحب نے کہا کہ جتنے لوگ ہمارے معاشرے میں نماز پڑھتے ہیں اگر وہ اپنے اخلاق درست کر لیں مثلاً جھوٹ بولنا چھوڑ دیں تو معاشرے میں اسلامی تبدیلی آ سکتی ہے۔ سینئر صحافی تاثیر مصطفیٰ صاحب نے کہا کہ دینی حلقوں کی پالیسیاں صریحاً ناکام ہو چکی ہیں اور اگر انہوں نے اپنی اصلاح نہ کی تو پاکستانی معاشرے کا دینی لحاظ سے کوئی مستقبل نہیں ہے۔

منہاج یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے مفتی ڈاکٹر محمد شفیق صاحب نے کہا کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ دینی جماعتیں اور ادارے ناکام ہو چکے ہیں۔ ملک بھر میں دینی ادارے اور جماعتیں متنوع دینی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لاکھوں اور کروڑوں کے اجتماعات ہوتے ہیں۔

مساجد اور مدارس آباد ہیں، گو اپنے اپنے مسلک کے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا مبالغہ آرائی ہے کہ دینی ادارے اور جماعتیں ناکام ہو چکی ہیں۔

مکرم محمود صاحب نے کہا کہ دینی اداروں کی سرگرمیاں قابل تعریف ہیں لیکن مغرب کی ڈیجیٹلائیزیشن اور ٹیکنالوجیکل ترقی نے دنیا بھر کے افکار و اعمال کو زیروزبر کر رکھا ہے لہٰذا جب تک ہم اس چیلنج کو نہیں سمجھیں گے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش نہیں کریں گے ہم معاشرے میں کوئی نتیجہ خیز تبدیلی نہیں لاسکیں گے۔

ڈاکٹر علی اکبر الازہری صاحب نے کہا کہ افراط و تفریط سے بچ کر معتدل انداز میں سوچنا چاہیے۔ بلاشبہ ہماری دینی جماعتیں اور ادارے پوری طرح سرگرم عمل ہیں اور اس کے مفید نتائج بھی نکلے ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اصلاح و بہتری کی گنجائش بھی موجود ہے لہٰذا دینی جماعتوں اور اداروں کو اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی کرنے اور انہیں مزید مؤثر بنانے پر غور ضرور کرنا چاہیے۔

پروفیسر عاصم حفیظ صاحب نے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی نشستیں بہت ضروری ہیں تا کہ اہل علم و دانش معاشرے کو درپیش مسائل پر مل بیٹھ کر غور کرسکیں۔ انہوں نے کہا جب تک دینی شعور رکھنے والے لوگ نیٹ ورکنگ نہیں کریں گے اور باہم مشاورت اور تعلقات سازی کو اہمیت نہیں دیں گے، مؤثر کام نہیں ہو سکے گا۔

ڈاکٹر مبشر صاحب نے کہا کہ ملک میں دینی اور اخلاقی بحران موجود ہے اور یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اس پر ملک گیر سطح کا ایک دن بھر کا سیمینار ہونا چاہیے جس میں ملک بھر کے اہل فکر و دانش کو دعوت دی جائے کہ وہ اس موضوع پر قوم کی رہنمائی کریں۔

اس نشست میں جو اصحاب علم تشریف لائے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

* پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، مدیر البرہان، لاہور
* پروفیسر ڈاکٹر مبشر حسین، ایسوسی ایٹ پروفیسر شیخ زائد اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی
* پروفیسر ارشد جاوید، معروف ماہر نفسیات، لاہور

* پروفیسر ڈاکٹر علی اکبر الازہری، شعبہ علوم اسلامیہ، گیریژن یونیورسٹی، لاہور
* پروفیسر ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، ایسوسی ایٹ پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی
* پروفیسر حافظ محمد اشرف، گورنمنٹ کالج آف سائنس، لاہور
* پروفیسر ندیم غفور چوہدری، شعبہ کمپیوٹر سائنس، کامسیٹ یونیورسٹی، لاہور
* ڈاکٹر محمد شفیق، شعبہ علوم اسلامیہ، منہاج یونیورسٹی، لاہور
* محمد عاصم حفیظ، صدر شعبہ ابلاغیات، ایم اے او کالج، لاہور
* فخر الاسلام، ڈائریکٹر پروگرامنگ، پیغام ٹی وی، لاہور
* تاثیر مصطفیٰ، سینئر صحافی، لاہور
* مکرم محمود، مدرس قرآن اکیڈمی، لاہور
* منیب علیم اعوان، ایم فل سکالر، یو ایم ٹی، لاہور
* حسان خالد، صحافی، روزنامہ ایکسپریس، لاہور
* محمد اشرف شکوری، اسسٹنٹ منیجر سمیڈا، لاہور
* اطہر رشید، سکول کونسلر و ماہر نفسیات
* حافظ محمد عمران طحاوی، پی ایچ ڈی سکالر، یونیورسٹی آف لاہور
* بلال احمد، اسلامی سکالر، لاہور
* اویس حمید خان، ایم فل سکالر، پنجاب یونیورسٹی

راقم معذرت خواہ ہے کہ چونکہ وہ میزبانوں میں شامل تھا اس لیے بعض انتظامی کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے زیادہ تفصیلی نوٹس نہ لے سکا۔ آئندہ مجلس فکر و دانش کی سرگرمیوں کی زیادہ تفصیلی رپورٹ قارئین البرہان کی خدمت میں پیش کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

فکرودانش

مکرم محمود[1]

اہل علم وعمل میں توافق کی ضرورت

اگر چہ ہماری دینی روایت میں فکر وعمل، قول وفعل، نظر وشغل میں اصولاً دوئی کا تصور نہیں پایا جاتا مگر اس کے باوجود تاریخی اور تہذیبی جبر کے نتیجے میں اس دوئی نے ہمارے ہاں بھی راہ بنالی ہے۔ اس دوئی کا کوئی جواز ان مقامات اور ان مباحث میں تو نہیں ہے جو خاص ہمارے ہیں اور ہمارے دین سے ایک ضروری نسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً ضروریاتِ دین میں شامل وہ عقائد اور اعمال جہاں کوئی چھوٹ نہیں مل سکتی اور جو براہِ راست آخرت میں ہماری نجات سے متعلق ہیں، ہاں فروعات میں یہ تقسیم انسانی مزاج اور شاکلہ کے فرق کی وجہ سے ہمارے ہاں بھی قابل قبول رہی ہے۔ لیکن کچھ ایسے مباحث ومسائل جو ہماری علمی روایت کی داخلی جدلیات کی بجائے جدیدیت اور اسلام کی تہذیبی جدلیات سے وقوع پذیر ہوئے ہیں ان میں اہل نظر اور اہل اشتغال کی دوئی جیسے جبری طور پر ہمارے ہاں واقع ہوئی ہے اور یہ دوئی ان مباحث ومسائل کی نوعیت کے ساتھ ایک گونہ مناسبت بھی رکھتی ہے۔ یہ بات اس حقیقت کو بھی ثابت کرتی ہے کہ یہ مباحث و مسائل جدید اور خارجی ہیں، روایتی نہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم ایسے ماحول میں جیتے ہیں جہاں یہ دوئی جیسے فطری ہے (ایسا یقیناً نہیں ہے کہ جدید معنوں میں فکر وعمل کا اجتماع کسی انسان میں نہیں ہوسکتا، بالکل ہوسکتا ہے یہاں بات عمومی حوالے سے کی گئی ہے) تو اس دوئی کو ان مسائل سے متعلق جو ہماری روایت کی داخلی ساخت اور علمی حرکت کے نتائج نہیں ہیں بلکہ جدید فکر وعمل کے حاصلات ہیں، کیا ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی؟ یا ان میں یعنی اہل نظر اور اہل اشتغال (Activists)، اصحابِ علم وفکر اور اصحابِ عمل میں باہمی تعامل کی کوئی صورت نکالی جائے گی؟

سادہ الفاظ میں جو لوگ جدید دنیا کی تفہیم کا ایک مکمل تناظر اور اس کی اصلاح وتبدیلی کا کوئی منہج رکھتے ہیں ان سے اس پر عمل کا بھی اسی شدت سے مطالبہ کیا جائے گا یا ان کے افکار سے اصحابِ میدان وعمل اپنے لیے عمل ومزاحمت کی نئی راہیں دریافت کریں گے۔ یہ دوسری بات زیادہ قابل عمل ہے اور

[1] مدرس قرآن اکیڈمی، لاہور (ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے نواسے)

جدید حالات میں زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں یہی مسئلہ درپیش ہے کہ اخذ واستفادہ کا مزاج نہیں ہے۔ اصحابِ عمل اپنے عمل کی بنا جن تصورات ونظریات پر استوار کرتے ہیں ان کو قطعی سمجھ لیتے ہیں اور اس میں کسی تبدیلی کے روادار نہیں ہوتے۔ وہ جن قائدین کے مقلدین ہوتے ہیں انہوں نے کسی دور میں بعض طرق کو انسب سمجھ کر اختیار کیا ہوتا ہے اور اگر اس زمانے کے حالات میں رکھ کر ان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ واقعی مناسب ہوتے بھی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ پچھلے دور کا انسب اگلے دور کا غیر انسب ہوجاتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ نہ سمجھنے والے اس بات کو سمجھ کے ہی نہیں دیتے۔ اہل نظر تو بر بنائے نظر صورتِ حال میں ہونے والی تبدیلیوں اور قدیم طرق ہائے تبدیلی واصلاح کو فرسودہ ہوتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں مگر اہل اشتغال اپنے عمل کی بنا فکر کے بجائے تقلید پر رکھتے ہیں اس لیے ان تبدیلیوں کا ادراک کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ شاید ان کے لیے فطری بھی ہے اس لیے اصل مسئلہ ہمیں اس سے نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اہل نظر وفکر سے استفادہ کی طرف مائل نہیں ہوتے۔

اسی طرح جدید کمیونیکیشن اور میڈیا ٹیکنالوجیز کا استعمال تو ہو ہی رہا ہے اور تقریباً سب ہی کررہے ہیں۔ اس کے شاغلین اگر اصحابِ نظر یعنی وہ لوگ جو اس کو نظری بحث کا موضوع بناتے ہیں اور اس کی حقیقت وماہیت، اس کی نظریاتی بنیادوں اور نفسیاتی نتائج پر غور وخوض کرتے ہیں، سے استفادہ کی کوئی راہ نکالیں تو ممکن ہے کہ اس کے بہت سے مفاسد اور اضرار سے بچ سکیں اور اس کے استعمال میں کچھ ضروری اور مفید حدود قائم کرسکیں لیکن اگر بغیر غور وفکر کے یا ایسے لوگ جو اہل نظر ہیں ان سے استفادہ کے ان چیزوں کو ان کی سطحی ہیئت اور ظاہری سطح پر رکھتے ہوئے استعمال اور برتنا شروع کردیں تو اس کے پریشان کن نتائج نکل سکتے ہیں۔ کیونکہ ان ذرائع میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ دیے جانے والے پیغام اور پیغام دینے والے آدمی دونوں کو بدل کر رکھ دیں اور اس تبدیلی کا ادراک بھی نہ ہو۔ بات وہی ہے کہ غور وفکر کرنے والوں اور میدان عمل میں ہاتھ پاؤں مارنے والوں میں ربط وتعلق کی کوئی سبیل پیدا کی جائے۔ جس طرح انسان کے لیے اس کے عمل کا منبع اس کا ارادہ واختیار نہ ہو بلکہ جو کام جس طریقے سے کیے جارہے ہیں وہ ان کو اسی طریقے پر کیے چلے جاتا ہو تو ان اعمال کو انسانی نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح انسانوں کے اجتماعی اعمال بھی اگر ان کے ارادہ واختیار سے صادر نہ ہوں تو ان کو بھی شعور سے خالی محض میکانکی افعال ہی قرار دیا جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر ونظر اور اہل علم واشتغال میں باہمی اخذ واستفادہ، افہام وتفہیم اور تعامل کی کوئی صورت پیدا کی جائے اگر یہ نہ ہوا تو ہماری فکر مجرد ہی رہ جائے گی اور ہمارا عمل بے اصل واساس اور بے ثمر ہی رہ جائے گا۔

تبصرۂ کتب ڈاکٹر عبدالحسیب مجاہد

کتاب نما

'مقالات تعلیم' از پروفیسر ملک محمد حسین۔ مرتبہ: مدیر البرہان

مقالات تعلیم پروفیسر محمد حسین ملک کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ البرہان، ماہنامہ افکار معلم اور دوسری جگہ شائع ہوئے یا پڑھے گئے۔ اسے جسے ڈاکٹر محمد امین صاحب نے بہت محبت اور محنت سے مرتب کیا ہے۔

کتاب ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب تعلیم اور نظام تعلیم کے ایک پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلا باب تعلیم کی آئینی اساس، تعلیمی پالیسیوں اور بحیثیت مجموعی تعلیمی نظام کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ دوسرا باب نصابیات اور خاص طور پر سنگل نیشنل کریکولم کے متعلق مباحث کے در وا کرتا ہے۔ تیسرے باب میں تعلیم، تربیت اور اصلاح معاشرہ کی بات کی گئی ہے جبکہ چوتھا باب تعلیمی مسائل، مشکلات اور ان کے حل کے متعلق ہے۔ پانچواں باب تعلیم کی اسلامائزیشن جیسے اہم موضوع کا احاطہ کرتا ہے جبکہ چھٹا باب پاکستان کے نظام تعلیم پر بیرونی اثرات اور تہذیبی چیلنجز جیسے فکر انگیز موضوع کو سموئے ہوئے ہے۔ ساتواں باب اعلیٰ تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لاتا ہے اور آٹھویں باب میں معلم، عمل تدریس اور تربیت معلم کو موضوع بنایا گیا ہے جبکہ نویں باب میں معیار تعلیم اور چند ہم عصر ممالک کے تعلیمی نظام کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔

دسویں باب میں متفرق موضوعات پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں اور گیارہواں باب میں تنظیم اساتذہ کی تاریخ، اور تعلیمی سلسلے میں اس کے موثر کردار پر لکھے گئے مضامین شامل اشاعت ہیں۔ بارہواں باب لعل و گہر کے نام سے جس میں ان کے مرحوم دوستوں مثلاً حافظ وحید اللہ خان، پروفیسر رب نواز، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر سید نعیم شاہ اور پروفیسر عبدالحمید ڈار کے خاکے ہیں۔ تیرہویں باب میں پروفیسر محمد حسین ملک پر لکھے گئے تین مضامین کتاب کا حصہ ہیں۔ پہلا مضمون ان کی صاحبزادی ڈاکٹر طاہرہ کلثوم نے لکھا ہے جبکہ دوسرا مضمون ان کے دوست، ساتھی اور غمگسار جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب کا اور تیسرا مضمون معروف ماہر اقبالیات جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا ہے۔ کتاب اپنے اندر متنوع موضوعات سمیٹے ہوئے ہے جو شائقین علم خصوصاً شعبۂ تعلیم کے طلبہ اساتذہ کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

تبصرۂ کتب　　مدیر

افغانستان ۔سلطنتوں کا قبرستان　از میر افسر امان

یہ کتاب معروف کالمسٹ اور مصنف میر افسر امان کے اخباری کالموں کا مجموعہ ہے جو وہ پاکستان، بھارت، مقبوضہ کشمیر اور بیرون پاکستان لکھتے رہے ہیں۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ افغانستان نے کس طرح تین سپر پاور کہلانے والے ممالک برطانیہ، روس اور امریکہ (ویورپ) کو شکست دی اور اپنی آزادی کا دفاع کیا۔ کتاب میں جناب لیاقت بلوچ صاحب (جماعت اسلامی)، ریاض احمد چوہدری صاحب (ڈائریکٹر بزم اقبال لاہور) اور راقم الحروف کی تقریظات بھی شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانیوں نے پچھلی ایک صدی میں ایک غیرت منداور نا قابل شکست قوم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے جان و مال کی عظیم قربانیاں دے کر اپنی آزادی، دین اور اقدار وروایات کا تحفظ کیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں شکست کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب ایک نہتا مسلمان ملک امریکہ ویورپ کی متحدہ قوت کو شکست دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ مسلم تاریخ ہی نہیں انسانی تاریخ کا ایک تابناک معجزہ ہے۔ عصر حاضر میں افغان قوم حریت وشجاعت کے ماڈل کے طور پر ہمارے سامنے آئی ہے۔ امت مسلمہ کو افغانیوں سے سبق سیکھنا چاہیے اور مغربی ومشرقی استعمار کی فکری وعملی غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد اور اسلامی روش اختیار کرنی چاہیے۔ ہر مسلمان کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے تاکہ اسلامی عظمت وحریت کا بھولا ہوا سبق اسے یاد آ جائے۔

۲۵۶ صفحات کی یہ کتاب 'اقبال، قائد، مودودی فکری فورم' (مکان نمبر ۶۸۶، گلی نمبر ۱۰۰، سیکٹر آئی ٹین فور اسلام آباد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ قیمت ۵۰۰ روپے، رابطہ 0321-3897328

مولانا ظہور احمد بگویؒ ۔حیات وخدمات　از ڈاکٹر انوار احمد بگوی

اس کتاب کے مصنف صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی اگرچہ پیشے کے لحاظ سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن عمدہ ادبی اور تاریخی ذوق رکھتے ہیں اور سیال قلم کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان اور آباؤاجداد کے دینی وملی کارناموں کو منضبط کرنے میں نہایت جانفشانی سے کام لیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی کئی ضخیم تصانیف سامنے آچکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ان کے جدامجد مولانا ظہور احمد بگوی (۱۹۰۰-۱۹۴۵ء) کے حالات زندگی

اوران کی ملی، دینی وسیاسی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے۔انہوں نے تحریک خلافت میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور تحریک پاکستان میں بھی سرگرم حصہ لیا۔تحریک پاکستان ورکرز ٹرسٹ کی طرف سے صدر پاکستان جناب عارف علوی نے مولانا ظہور احمد بگویؒ کی تحریک پاکستان میں خدمات پر انہیں گولڈ میڈل پیش کیا جو مصنف نے فروری ۲۰۲۲ء میں وصول کیا۔

انگریزی مضامین سمیت کتاب ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ سے مل سکتی ہے۔برائے رابطہ فون:0300-6053882

اللہ پرستی پر مبنی روحانی کلچر   از حافظ محمد موسیٰ بھٹو

حیدرآباد (سندھ) سے حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب اپنی پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود اس کثرت سے اپنے مشن کے حق میں لکھتے ہیں کہ ہر مہینے دوسرے ایک متوسط حجم کی کتاب قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔مشن ان کا کیا ہے؟ یہ کہ لوگ اپنے تزکیۂ نفس کی طرف توجہ دیں، اللہ سے لو لگائیں، اپنے اخلاق و اعمال کی اصلاح کریں اور مغرب کی دجالی تہذیب کی پیروی کرنے کی بجائے اپنے اسلاف کے طرز عمل کو اپنائیں۔اللہ کرے قوم حافظ صاحب کی تذکیر کی طرف توجہ کرے۔

یہ کتاب (اللہ پرستی پر مبنی روحانی کلچر۔وقت کی سب سے اہم ضرورت (موجودہ صورتِ حال کے تناظر میں) صفحات ۱۰۴، قیمت ۱۰۰ روپے اور حافظ صاحب کی دوسری مطبوعات سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، ۴۰۰ بی، لطیف آباد، حیدرآباد سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

یادِ اقبال   از جمیل اطہر قاضی

ہمارے عہد میں فکرِ اقبال کی ترویج کی کوشش ایک طرح سے اسلامی ذہن کی آبیاری کے مترادف ہے کیونکہ اقبال کے اشعار نے امت مسلمہ پاک و ہند کو جگانے اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی طرف بڑھنے کی راہ ہموار کی ہے۔معروف صحافی جناب جمیل اطہر قاضی صاحب، جو اپنے عہد جوانی میں مصطفیٰ صادق مرحوم کے ساتھ مل کر ہفت روزہ 'وفاق' نکالا کرتے تھے، انہوں نے اس جریدے میں ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک جو کچھ اقبال پر لکھا اور لکھوایا، اس کو مدون کر کے اس کتاب کی شکل دے دی ہے۔اعلیٰ کاغذ پر طبع کردہ ۲۱۶ صفحات کی یہ کتاب، جس کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔بک ہوم، ۴۶ مزنگ روڈ، لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔رابطہ:042-37231518

Dr. Javed Akbar Ansari

The Imperialist Attack on Islamic Orthodoxy

We are orthodox Muslims. What does that mean An orthodox Muslim is someone who accepts the historical traditional interpretation of Islamic texts and events. We believe in the authenticity of Islamic history and Islamic traditions. We believe that the Ulema and the Sufiya have conveyed and are conveying the true message of Islam as revealed to the Prophet (SAW) throughout our history. The Ulema and the Sufiya are our leaders, teachers and guides. We are the servants of the Ulema and the Sufiya.

The imperialists are afraid of orthodox Islam. They fear us because orthodox Islam is the definitive critique of the secular modernist/postmodernist way of life of the capitalist lifeworld and the capitalist system. When an individual, a society and a state becomes a part of the Islamic historical tradition it necessarily poses a universalizing challenge to capitalism/modernism/ postmodernism as truth and falsehood (Islam and Jahiliya) cannot coexist. The triumph of one must mean the defeat of the other.

The Imperialist Attack

In the Indo-Pak subcontinent the imperialist attack on orthodox Islam began in the 18th century. In the next hundred years it flowered with the establishment of institutions such as Delhi College, Fort William College and what was to become the Aligarh Muslim University. Its leading proponent was Sir Syed Ahmad Khan, a traitor, who worked for British imperialists during the 1857 jihad and for forty years afterwards.

The main strategy of the imperialists and the quislings

who were their camp fellows was to reinterpret Islamic history and traditions according to Western epistemological paradigms. Secularists had been very successful in reinterpreting Christian history and traditions along these lines during the ages of Reformation and Enlightenment. Christianity has been so thoroughly modernized that today Pope Francis is an enthusiastic advocate of homosexuality. The imperialists have also been eminently successful in modernizing Hinduism as reflected in the emergence of Hindutva.

Sir Syed, Ghulam Ahmad Pervaiz, Khalifa Abdul Hakeem and their present day followers Javed Ghamidi and Waheeduddin Khan seek to delegitimize Islamic historical tradition and present a rational interpretation of our foundational text the Quran. They challenge the authenticity of the corpus of all Hadith texts(the Sahah Sitta. They reject the authenticity of consensus (ijma) and show contempt towards the examples set by the companions and their followers. They reinterpret Islamic teachings in the light of *jahili* knowledge, system (phenomenology, hermeneutics, etc).They cast doubt on the intentions of the Ulema and Sufiya and accuse them of selfishness and bad faith.

Another group challenging orthodox Islam are the revisionists and the revisionists unfortunatly include a section of the Ulema, too. Hazrat Maulana Obaidullah Sindhi used to justify socialist practices on Islamic grounds. Today Maulana Taqi Usmani proclaims Islamic legitimation for usury and speculative money and capital market transactions. He calls it Islamic banking. These revisionists reject Shah Waliullah’s teachings that Islam is a complete self-sustaining closed system and way of life.

Our Response

The purpose of the projects pursued both by the imperialists camp followers and the revisionists is to delegitimize Islamic historical traditions and introduce practices in the Islamic life world that are totally foreign to our history such as capital market transactions and nationalistic political discourses. This is an attempt to modernize Islam and to subordinate it to capitalist epistemological and systemic governance. Imperialist camp follows and revisionists are following in the footsteps of those intellectuals who have paved the way for the subsumption of Christianity and Hinduism within the capitalism system.

To meet the challenge, we have to reject all rationalist/modernist/ postmodernist interpretations of Islamic texts and our historical traditions. Authentic Islam is that which has been revealed and is being revealed in our history. Interpretive methodologies as practiced in our knowledge systems are our social historical heritage. They must be safeguarded from imperialist sabotage and their scope extended for analysis of problems that emerge today.

At the same time, we must seek to expose contradictions of rational interpretations and ethical and social behaviors. Rationality is not عقلیت but the subjection of action and decision making to the evil commands of *Nafs-e-Ammara*(the baser self). We must reject rationality as a source for legitimating individual and social behaviors for in practice this amounts to a justification of the universalizing of lust(حرص وہوس)*Aqliat*(عقلیت)should seek to serve revelation(وحی)not the Nafs-e-Ammara.

CPL No. 296 Monthly Al Burhan December 2022

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ

”تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کریں اور (دوسروں کو) اس کی تعلیم دیں۔“

صرف پندرہ منٹ روزانہ میں

گھر بیٹھے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا سیکھیے

تدریس القرآن ①

پہلا پارہ (مترجم و معریٰ دونوں)

مرتب

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

صدر تحریکِ اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

بلا معاوضہ طلب کریں

مندرجہ ذیل نمبرز پر اپنا ڈاک کا پتا واٹس ایپ کریں

0300-4107282 0309-4607124

آن لائن مطالعہ کے لیے www.alburhaan.pk

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ ای میل ermpak@hotmail.com